ڈاکٹر فیض الدین احمد

استاد،

کالج سیکشن، کراچی گرائمر اسکول، کراچی

سانحہ مسجدِ کان پور: مسلم اردو صحافت کا رد عمل اور شعری منظر نامہ

ABSTRACT

The tragedy of Kanpur Mosque: Reaction of Muslim Urdu journalism & poetical scenario

By Dr. Faiz Uddin Ahmed, Teacher, College Section, Karachi Grammer School, Karachi.

The battle of Balkan had not even come to a logical end that the painful event of Kanpur mosque took place. The Muslims of India were busy consoling their Arab & Turk brothers that this dreadful event dragged all of the attention. A mosque famously known as Machli Bazaar Mosque was situated on Meston Road, Kanpur. In order to extend the road, the British government demolished a portion of the aforesaid mosque while keeping the temple on its way undisturbed. The Muslims violently protested against the demolition and this news was brought to the headlines of all leading newspapers. "Zameendaar" & "Al-Hilal" strongly condemned the demolition.

Few Non-Muslim authorities also regretted this demolition. In reaction to this harsh event, Indian Muslims moved a countrywide movement against the British government. Many prominent men of letters including Syed Suleiman Nadwi, Hasan Nizami, Shibli Nomani and Maulana Zafar Ali Khan recorded their protest through poetry and prose. Finally, this strong and violent public reaction brought the British government on their knees and the decision was taken back. All prisoners were released and criminal cases were withdrawn. The demolished portion of the Kanpur mosque was rebuilt by the government. The event of Kanpur mosque provoked the first protesting behaviour against the British Colonialism. This actually led the nation to the road of independence afterwards. Thus this event is of great importance in the history of Indian Sub-continent.

(۱)

جنگ بلقان ابھی اپنے منطقی انجام کو بھی نہ پہنچی تھی کہ ''مسجد کان پور کا دردناک واقعہ پیش آیا۔''[۱] مسلمانانِ ہند

ابھی اپنے عرب اور ترک بھائیوں کے مصائب کو کم کرنے میں مصروف تھے کہ اچانک یہ خونیں حادثہ رونما ہوا جس نے وقتی طور پر پوری توجہ کو اپنی جانب مبذول کر لیا۔[۲] واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ کان پور کی ایک شاہ راہ مسٹن روڈ پر ایک مسجد واقع تھی جو مسجد مچھلی بازار کے نام سے مشہور تھی۔[۳] برطانوی حکومت نے سڑک کی توسیع کا منصوبہ بنایا مگر اس منصوبے کی تکمیل سے مسجد مچھلی بازار اور مندر پر زد پڑتی تھی۔[۴] حکمرانوں نے ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے مندر تو بچا لیا لیکن مسجد کے کچھ حصے کے انہدام کو حتمی شکل دے دی گئی۔ اس صورت حال پر اس زمانے کا مشہور شعر ہے کہ:

کھو گئی کان پور کی مسجد
رہ گیا بت کدہ مگر باقی[۵]

مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی پرواہ کیے بغیر طے یہ کیا گیا کہ مسجد کو تو سڑک کے بیچ میں لے لیا جائے لیکن اس کے غسل خانے اور پاخانے کو ڈھا کر اسے سڑک کا جزو بنا لیا جائے۔[۶] لہٰذا مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود مسجد کا وضو خانہ جو سڑک کے بیچوں بیچ آتا تھا،[۷] مسمار کر دیا گیا۔ مسجد کے وضو خانے کے انہدام کا واقعہ کس تاریخ کو پیش آیا اس بارے میں متضاد آرا ملتی ہیں۔ ضیا الدین احمد برنی کے مطابق ''۳ جولائی ۱۹۱۳ء کو مسجد کا وہ حصہ شہید کر دیا گیا جہاں وضو خانہ اور پاخانہ واقع تھا۔''[۸] لیکن ان کی بتائی ہوئی تاریخ درست نہیں کیوں کہ اس سانحے کی لحہ بہ لحہ روداد ''الہلال'' اور ''ہمدرد'' کے اوراق کی زینت بنتی رہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سانحے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بڑے واضح انداز میں لکھا کہ:

> ''یکم جولائی کی تاریخ مسلمان کبھی نہیں بھول سکتے، جب کہ بندوقوں اور سنگینوں کے حصار میں کان پور کی مسجد کا ایک مقدس حصہ شہید کر دیا گیا اور اس طرح پورے فوجی ساز و سامان کے ساتھ اس اعلان کردہ مذہبی آزادی کا جنازہ اٹھا جس کے پُتلے کو ایک صدی سے زائد عرصے تک ہندوستان میں زندہ و متحرک دکھلایا گیا تھا۔''[۹]

''الہلال'' میں شائع ہونے والے محمود احمد عباس علیگ کے مراسلے کے مطابق ''یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو علی الصباح خانۂ خدا کی دیواریں گرنے لگیں۔''[۱۰] روزنامہ ''ہمدرد'' میں اس سانحے کے رونما ہونے سے کافی پہلے ہی مسجد مچھلی بازار کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات اور اس میں ہونے والی پیش رفت کا احوال وقتاً فوقتاً درج ہوتا رہا۔ رئیس احمد جعفری نے ۸/ جولائی ۱۹۱۳ء کے روزنامہ ''ہمدرد'' میں شائع ہونے والے ایک طویل مقالہ افتتاحیہ کا اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھا کہ ''یکا یک ۳۰/ جولائی ۱۹۱۳ء کو ہز آنر سر جیمس مسٹن خود کان پور تشریف لائے اور مسجد کا معائنہ فرمایا، کسے معلوم تھا کہ ہز آنر کی تشریف آوری کی شب حصہ مسجد کی شب رحلت ہو گی۔''[۱۱] لیکن بہ غور مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ درست تاریخ ۳۰/ جولائی نہیں بلکہ ۳۰/ جون ہو گی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل خود روزنامہ ''ہمدرد'' کی مذکورہ اشاعت کی تاریخ ہے کیوں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ۸/ جولائی ۱۹۱۳ء کے روزنامے میں ۳۰/ جولائی ۱۹۱۳ء کو پیش آنے والا واقعہ درج کیا جا سکے۔ اپنے اسی

مضمون میں ''ہمدرد'' نے لکھا کہ:

> ''علی الصباح سنگین چڑھائے ہوئے مسلح پولیس کے سپاہی مسجد کے چاروں طرف متعین ہو گئے ..... ہمارے خاص کارسپانڈنٹ نے اس روز جو تار دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی طرف کے تمام راستے روک دیے گئے .....لوگ بہت جلد سمجھ گئے کہ یہ ساری تیاری مسجد کے اس حصے کو منہدم کرنے کے لیے ہے جو سڑک کی داغ بیل میں آتا ہے۔''(۱۲)

محمود احمد عباس نے اس مسجد کے انہدام کا ذمے دار مسجد کے متولی کریم احمد کو ٹھہرایا ہے۔(۱۳) ان کا کہنا ہے کہ ''۱۹۰۹ء میں جب کہ اے۔ بی۔ روڈ کے متعلق پیمائش جاری تھی، اور عام لوگوں کو معاوضہ دیا جا رہا تھا۔ اس وقت افسر معاوضہ منشی اودھ بہاری لال صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ مسجد میں تشریف لائے تھے، اور انھوں نے متولیوں سے جزو منہدم کے علاوہ کچھ صحن مسجد بھی لینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ کریم احمد صاحب متولی نے ان الفاظ میں وعدہ کیا تھا کہ ہم مطلوبہ حصہ دے دیں گے'' ..... چناں چہ مسجد کے ابتدائی مثل [کذا] میں افسر معاوضہ کے یہ بیانات مذکور ہیں کہ ''متولی مسجد جزو مسجد دینے پر آمادہ ہے''۔ متولی کریم احمد نے اس بات کی تردید کرتے ہوئے ''الہلال'' ہی میں ایک مراسلہ بھیجا جس میں دوٹوک الفاظ میں کہا کہ ''میں نے کوئی منظوری زبانی یا تحریری کسی حاکم کو نہیں دی۔''(۱۴) لیکن حقائق یہی ہیں کہ اس معاملے میں متولی نے مثبت کردار ادا نہیں کیا۔

۱۹۰۹ء سے شروع ہونے والے اس تنازعے کو بروقت حل کرنے کے انتظام کیے جاتے تو معاملہ اس نہج پر کبھی نہیں پہنچتا۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ مسلمانوں کو ۱۹۱۲ء کے اواخر میں ہوا جب مجسٹریٹ کان پور مسجد کے معائنے کی غرض سے تشریف لائے۔ مسلمانانِ کان پور میں اس بات سے خاصی تشویش پھیلی۔ اہل شہر نے مسجد کے متولی کے پاس جا کر صدائے احتجاج بلند کیا مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں سر جیمس مسٹن کی کان پور آمد کے موقع پر بھی حکام بلدیہ اور ڈپٹی کمشنر کے عزائم سے آگاہ کرتے ہوئے لیفٹیننٹ گورنر سے استدعا کی گئی کہ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور مسجد کی حرمت کا خیال حکومت کو ہر حال میں رکھنا چاہیے جب کہ اسی سڑک پر واقع مندر کو بچانے کے لیے سڑک کو ٹیڑھا کیا جانا منظور تھا۔ اس واقعے کی پوری روداد 'ہیرالڈ آف انڈیا'' کان پور ۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں درج کی گئی ہے۔(۱۵) اس کے علاوہ ۸/جولائی کو ''ہمدرد'' میں شائع ہونے والے مذکورہ بالا مقالے میں بھی درج ہے کہ مسلمانانِ کان پور کے ایک جلسے میں پانچ علما جن میں مولانا آزاد سبحانی، پرنسپل مدرسہ الہیات بھی شامل تھے، وغیرہ نے مسجد کے انہدام کو خلافِ شریعت قرار دیا۔(۱۶) بااثر مسلمانوں کی جماعت نے اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے سے قبل تک اپنی تمام تر کوششیں کر لیں۔ مسٹر شاہد حسین بیرسٹر ایٹ لا نے ۱۴ اپریل ۱۹۱۳ء کو ہز آنر لیفٹیننٹ گورنر صوبہ جات متحدہ یو۔ پی۔ کی خدمت میں میموریل پیش کیا کہ چوں کہ اس حصے

کے انہدام سے ان کے مذہب پر دست اندازی ہوتی تھی جو حکومت کی مصلحت کے منافی تھا، لہٰذا حضور لیفٹیننٹ گورنر بہادر حصہ مسجد کو انہدام سے محفوظ رکھیں۔[۱۷] لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا بلکہ انھوں نے بھی وضو خانے کے حصے کو سڑک کا حصہ قرار دے ڈالا۔[۱۸]

''ہمدرد'' نے اس حوالے سے مزید لکھا کہ بیرسٹر شاہد حسین کی مراسلت ناکام ہوگئی تو راجا صاحب محمود آباد کو ایک محضر دے کر ہز آنر کی خدمت میں شملہ روانہ کیا گیا لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔[۱۹] مولانا محمد علی جوہر نے بھی سر جیمس مسٹن کو ذاتی خطوط لکھ کر اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ خصوصاً مجسٹریٹ کان پور مسٹر بٹلر کی اس حرکت پر جس میں وہ انہدامی کارروائیوں میں حصہ لینے پہنچے اور جوتوں سمیت اس حصے میں داخل ہوئے تو متولی سمیت کسی نے بھی انھیں اس اقدام سے نہ روکا۔ لہٰذا موصوف نے علی الاعلان کہا کہ ''متنازعہ حصہ کسی طرح مسجد کا جزو نہیں ہوسکتا اس لیے کہ کسی مسلمان نے وہاں بوٹ پہن کر جانے سے نہیں روکا۔''[۲۰] مولانا محمد علی جوہر نے اپنے ایک خط میں مسٹر بٹلر کی اس حرکت کو انتہائی شرم ناک قرار دیتے ہوئے لکھا کہ ''مہذب دنیا میں کیسا بھی کوئی مجسٹریٹ ہو، شہادت پیدا کرنے کے لیے ایسا افسوس ناک طریقہ نہیں اختیار کرسکتا۔''[۲۱] سر جیمس مسٹن نے مولانا کے ہر خط کا جواب دیا لیکن اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے۔ اپنے دستخط کے ساتھ جو تار انھوں نے بھیجا اس میں اس سڑک کی بناوٹ اور وضو خانے کے انہدام کو روکنے کی درخواست نامنظور کرتے ہوئے اگلے ماہ مسلمانوں سے ملاقات کا عندیہ دیا۔[۲۲] سر جیمس مسٹن نے اس سلسلے میں نہ تو علمائے کرام سے کوئی مشورہ کیا اور نہ ہی مسلمانوں کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کی بلکہ ضلع مجسٹریٹ مسٹر بٹلر نے جو گوشمالی کی اور حکمران قوم کا ایک فرد ہونے کے ناطے جوتوں سمیت مسجد میں گھسنے کی جو غلط قسم کی شہادت پیش کی اسے حقیقت جان کر مسجد کے انہدام کے فیصلے کو عملی جامہ پہنا دیا۔[۲۳] مولانا محمد علی جوہر بھی اتنی آسانی سے ہمت ہارنے والے نہیں تھے۔ وہ سید وزیر حسن کے ہمراہ خاموشی سے ولایت روانہ ہوئے تاکہ مسلمانانِ ہند میں اس سانحے کے بعد جو عام بیزاری اور ناراضی پھیل چکی تھی، اس سے برطانوی حکومت کے ارباب اقتدار کو باخبر کیا جاسکے۔[۲۴] مولانا محمد علی جوہر نے اس سلسلے میں برطانوی مدبروں سے ملاقاتیں کیں۔ برطانیہ کے با اثر لوگوں سے ملے اور عام جلسوں میں تقاریر کر کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی لیکن سب نے ہی سنی ان سنی کر دی اور مولانا محمد علی جوہر ایک طرح سے ناکام واپس لوٹے۔[۲۵]

مسلمانوں کی جانب سے مسجد کان پور کی شہادت پر سخت ردعمل سامنے آیا۔ اس زمانے کے اہم اخبارات و رسائل نے اس خبر کو جلی حروف میں شائع کیا۔ اخبار ''زمیندار'' کے پلیٹ فارم سے مسجد کان پور کی شہادت کے خلاف بڑھ چڑھ کر حملے کیے گئے۔ حکمران تو پہلے ہی مولانا ظفر علی خان سے خار کھائے بیٹھے تھے، ان کی جانب سے فوری ردعمل سامنے آیا اور سر مائیکل اوڈوائر کو ''زمیندار'' پر پابندی لگانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ چناں چہ اخبار ''زمیندار'' اور ''پریس'' دونوں کو ضبط کرتے ہوئے دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی جو اس زمانے میں خاصی خطیر رقم تھی، لیکن مسلم عوام نے اس رقم کا بندوبست کر کے ''زمیندار''

کی شمع کو گُل ہونے سے بچا لیا۔[۲۶]

رسالہ ''الہلال'' بھی اس سلسلے میں پیش پیش تھا۔ اس سانحے کے رونما ہونے سے قبل ہی مذکورہ رسالے میں اس موضوع سے متعلق مباحث کا آغاز ہو چکا تھا۔ مسجد کی حرمت سے متعلق متعدد مضامین اور منظومات سے صفحات کے صفحات بھر دیے گئے۔[۲۷] مسجد کے انہدام کے بعد مسلمانوں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی۔ کچھ پُر جوش مسلمان مسجد کے منہدم حصے کی مرمت کے لیے سرکاری حکام کے خلاف وہاں جمع ہو گئے جس کے نتیجے میں فوج نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔[۲۸] اس سانحے کی درست تاریخ کی بابت بعض محققین مغالطے کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ ''حیات شبلی'' میں سہواً ۱۳ اگست کی تاریخ درج ہے۔[۲۹] جب کہ ضیا الدین احمد برنی نے بعینہٖ مذکورہ تاریخ اور واقعے کو بغیر کوئی حوالہ درج کیے اپنی تصنیف ''حیات مولانا محمد علی جوہر'' میں دہرایا ہے۔[۳۰] اس کے علاوہ سید اشتیاق اظہر نے اس خونیں واقعے کی تاریخ ۲ اگست ۱۹۱۳ء بتائی ہے۔[۳۱] سانحے کے متعلق سید سلیمان ندوی نے اپنے مشہور مضمون ''مشہدِ اکبر'' میں واضح طور پر ۳ اگست کی تاریخ درج کی ہے۔[۳۲] یہ مضمون ابتداً ''الہلال'' میں شائع ہوا تھا جس کے بعد اخبار کی ضمانت ضبط ہوگئی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان دنوں کان پور ہی میں مقیم تھے، اس کامیاب مضمون پر انھوں نے سید سلمان ندوی کو مبارک باد کا تار بھی بھیجا تھا۔[۳۳] رئیس احمد جعفری کے مطابق اس روز مولانا آزاد سبحانی، جنھیں سیاست سے دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا اور جو اپنا وطن گورکھ پور چھوڑ کر کان پور محض درس گاہ ''مدرسہ الہیات'' کی خدمت کی غرض سے آئے تھے، مسجد کے انہدام کے بعد پہلی بار اپنی دنیا سے باہر نکلے اور شوقِ شہادت سے سرشار ہو کر ایسا خطاب کیا کہ پورے جلسے پر سحر طاری ہو گیا۔[۳۴] ان کی ولولہ انگیز تقریر نے ماحول ہی بدل ڈالا۔ بلا شبہ یہ دنیا کی تاریخ ساز تقریروں میں سے ایک تھی جو ذہنِ انسانی کو قربانی اور ایثار کی انتہائی سرحدیں چھونے پر مجبور کر دیتی ہے۔[۳۵] جلسے کے بعد پُر جوش مسلمانوں نے جن میں بچے بھی شامل تھے، مسجد کا رخ کیا اور مسجد کی منہدم دیوار پر اینٹیں چُن چُن کر رکھنے لگے۔[۳۶] برطانوی حکومت کے اس دور میں جب کہ ان کی قلم رو میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا، برصغیر میں سب سے پہلے اہل کان پور نے انھیں للکارا۔[۳۷] فرنگی استبداد کے لیے ماتحت رعایا کا یہ جذبۂ جہاد، کھلی بغاوت کا درجہ رکھتا تھا۔[۳۸] سید سلمان ندوی نے اس واقعۂ ہائلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:

مسٹر بٹلر ڈپٹی کمشنر کان پور نے یہ دیکھ کر کہ مسجد میں متعین سکھ فوج کو ان نہتے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ فوجی، پولیس کے سپاہیوں اور سواروں نے نہایت بے رحمی سے ان پر گولیاں برسائیں اور قریب آ کر برچھے مارے۔ شہیدوں اور زخمیوں میں ننھے منّے بچے بھی شامل تھے۔[۳۹]

مولانا آزاد کے مطابق اس دن کا ''آفتاب خون کے فوّاروں، لاشوں کے اضطراب، معصوم بچوں کے زخم ہائے خوں چکاں اور انسانی مظلومی و بے کسی کے اشک ہائے حسرت کے ساتھ افق کان پور پر طلوع ہوا۔''[۴۰] مسلح فوج ''دس منٹ تک اپنی بندوقوں سے اڑا اڑا کر ایک گولیوں کی چادر ہوا میں پھیلا دیتی۔ پردا جب چاک ہوتا ہے میدان میں خاک و خون

میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں۔''(۴۱) مولانا ابو الکلام آزاد نے مسجد میں ہونے والی گولیوں کی بوچھاڑ کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا کہ مسجد میں داخل ہوتے ہی محراب کی طرف پشت والی دیوار کے چھے سات فٹ کے فاصلے پر دونوں جانب گولیوں کے بے شمار نشانات ہیں۔ یہ نشانات اسی صورت میں پڑ سکتے ہیں جب پولیس اندر آ کر فائر کرے۔ جگہ جگہ خون کے دھبے دیواروں اور چوکھٹوں پر پڑے ہوئے ہیں اور یہ دھبے اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ خدا کے گھر میں بڑی تعداد میں خون ریزی کی گئی۔ اگر مسٹر بٹلر پہلے ہی احتیاط سے کام لیتے ہوئے مسجد کی طرف مسلح پولیس کے دستے متعین کر دیتے تو غالباً یہ بلوا نہ ہوتا۔(۴۲) اس پولیس کارروائی میں متعدد مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ بہ قول ڈاکٹر سید سعید احمد ''مسلمان مرتے جاتے تھے اور ان کی جگہ دوسرے مسلمان آگے بڑھ کر تعمیر کرنے لگتے۔''(۴۳) ۷ اگست ۱۹۱۳ء کو خواجہ حسن نظامی نے میرٹھ کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ: ''مسلمانوں کو لگا تار فائر کر کے خاک و خون میں ملا دیا۔ بزرگوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر گرتیں اور ان کی سفید داڑھیاں خون میں لال ہو جاتیں۔''(۴۴)

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بلوے کے شہدا کی تعداد محض ۲۲ تھی۔(۴۵) سید سلیمان ندوی نے ان اعداد و شمار پر اعتراض اٹھائے ہیں۔ وہ حکومتی بیانات کو طنز و تقریظ کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''گورنمنٹ کا فرشتۂ غیب ہم کو اطلاع دیتا ہے کہ میدان میں چودہ لاشیں تھیں۔ پھر بتاتا ہے کہ اٹھارہ لاشیں تھیں۔ عقیدت مند دل اس کو تسلیم کرتا ہے لیکن عقل حجت طلب کو کیوں کر سمجھائیں کہ ایک تنگ میدان میں دس پندرہ ہزار آدمیوں کا مجمع ہو۔ پولیس بے محابہ ..... ان پر گولیاں برساتی ہو ..... اور صرف اٹھارہ لاشیں اس کے صدمے سے گر پڑتی ہیں۔''(۴۶)

اپنی ایک اور تصنیف میں وہ سرکاری اعداد و شمار پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''شہدا کی تعداد کا صحیح اندازہ معلوم نہ ہو سکا۔ سرکاری اندازہ بیس تیس آدمیوں کا تھا۔''(۴۷) حکومتی اعداد و شمار ظاہر ہے کہ درست نہیں تھے۔ اس بات کی تصدیق یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء کے ''الہلال'' کی اشاعت سے بھی ہوتی ہے۔ اس شمارے میں روزنامہ ''زمیندار'' لاہور میں شائع ہونے والے ایک مراسلے کا ذکر ہے۔ یہ مراسلہ ایک ہندو زمیندار رام ناتھ کے دستخط کے ساتھ شائع ہوا۔ بعد میں ۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء کے ''الہلال'' میں بھی اس مراسلے کو نقل کیا گیا۔ رام ناتھ ایک مقدمے کے سلسلے میں یکم اگست سے ۱۸ اگست ۱۹۱۳ء تک کان پور میں مقیم رہے۔ اس مراسلے میں انھوں نے لکھا کہ:

> ''۳ اگست کا واقعہ مسلمانوں کا [کذا] نسبت مسجد مچھلی بازار میرے سامنے ہوا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جائے وقوعہ کے علاوہ شہر میں جہاں مسلمان نظر پڑے۔ بندوقوں کے فیر [فائر] سے ہلاک کر ڈالے گئے اور جائے وقوعہ یعنی مسجد میں

تو بے انتہا مسلمانوں کو گولیوں سے فنا کر ڈالا اور کوئی ڈیڑھ سو لاشیں بوریوں میں بند
کر کے جب کہ ہم اشنان کرتے تھے، دریا میں عجلت کے ساتھ پھینک دی گئیں .....
ہم یہ شہادت عدالت میں دے سکتے ہیں۔''(۴۸)

اس عینی گواہ کی شہادت کو مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنے ایک مضمون میں پیش کیا ہے۔(۴۹) اس سانحے کے رونما ہونے کے فوری بعد سید سلیمان ندوی جو اس وقت ''الہلال'' کے رکن ادارت میں شامل تھے(۵۰) نے ''مشہد اکبر'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا اس میں بھی لاشوں کو دریا برد کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''پلس [پولیس] نے تمھاری لاشیں دریا میں نہیں پھینکیں اور زمین میں دفن نہیں کیں تو یقیناً تمھاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھا لیا کہ رضوانِ الٰہی ان کا منتظر تھا۔''(۵۱) شہدا کی تعداد سے متعلق اگر مذکورہ دلیل بھی ناکافی ہوں تو اس بات کا حکام کے پاس کیا جواب تھا کہ پندرہ منٹ تک جاری رہنے والی مسلسل گولیوں کی بوچھاڑ، جس کے دوران پانچ سو کارتوس استعمال کیے گئے۔ اس بات کا اعتراف مسٹر ٹیلر کو بھی تھا۔(۵۲) مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کارتوسوں کی تعداد بتاتے ہوئے لکھا کہ ''چھے سو کارتوسوں کے وحشیانہ اسراف قوت کے بعد برطانوی انصاف کی نعش بالآخر گنگا میں دفنا دی گئی۔''(۵۳) اتنی بڑی تعداد میں کارتوس کسی نہ کسی پر تو استعمال کیے گئے لیکن حکومتی موقف بہرحال یہی رہا۔ گولیوں کے علاوہ سپاہیوں اور سواروں نے مظاہرین پر نہایت بے رحمی سے برچھے مارے۔ ان کے جسموں میں نیزوں سے سوراخ کیا گیا، لوگوں کی آنکھوں میں سنگین گھونپی گئی۔ ان کے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا۔(۵۴) غرض کہ اس خونیں واقعے میں سیکڑوں کی تعداد میں لوگ زخمی بھی ہوے۔(۵۵) ان زخمیوں میں کم عمر لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں۔ ''الہلال'' میں ایک آٹھ برس کی لڑکی کی تصویر بھی شائع ہوئی جس کا شانہ چھرّوں سے بری طرح زخمی تھا۔(۵۶) جس سے مسلح پولیس کی بربریت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ زخمیوں کے ساتھ ہونے والے سلوک کا اندازہ ۲۸ اگست کے روزنامہ ''ہمدرد'' کے وقائع نگار کے مکتوب سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے خاص خاص حصوں کو رئیس احمد جعفری نے بھی نقل کیا ہے جس کے مطابق ان زخمیوں کو دیکھنے کے لیے سول سرجن سے ملاقات کرنے کے لیے بھی لوگوں کو پون پون گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ ادھر لوگ زخم سے چور چور تھے اور اُدھر موصوف ناشتہ تناول فرما رہے تھے۔ دیر سے آکر تاخیر کا یہ عذر پیش کیا کہ ''میں بھول گیا تھا، معاف کیجیے۔''(۵۷) ملاقات کے لیے اجازت نامہ تحریری طور پر جب مل گیا، جیل کے دروازے پر ان مجروحین کے عزیز و اقارب بڑی تعداد میں موجود تھے، اجازت نامہ داروغۂ جیل کو پہنچایا گیا۔ شفاخانے میں مجروحین برآمدے تک میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک زخمی امید علی کو بہت ضربیں آئی تھیں۔ بندوق کے چھرّوں اور نیزے کے کچوکوں سے اسی بری طرح زخمی کیا گیا تھا۔ زخمیوں میں بوڑھے اور کم عمر افراد کی بڑی تعداد تھی۔ دو سگے بھائیوں نور الٰہی اور اشفاق الٰہی کی حالت تو قابلِ رحم تھی۔ ان میں سے اشفاق الٰہی جو بارہ برس کا تھا، بعد میں شہید ہو گیا۔ دوسرے کی دماغی حالت پر بہت منفی اثر پڑا۔ ڈاکٹر عبدالصمد ان زخمیوں کی مرہم پٹی اور دل سوزی میں لگے ہوئے تھے۔ ۱۰۷ گرفتار مجروحین کا علاج وہاں ہو رہا تھا۔(۵۸) خواجہ حسن نظامی

کے مطابق:

ایک ایک پلنگ پر دو دو زخمی نظر آئے ..... کسی کی آنکھ میں نیزے کی انّی چبھ گئی، کسی کا سینہ زخموں سے چُور ہے، کوئی خون تھوک رہا ہے، کسی کا سر پھٹ گیا ہے، کسی کا دھڑ سنگین سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے..... کسی کے ہاتھ میں برچھیوں کی نوکیں گھُس گئی ہیں، کوئی تڑپتا ہوگا، کوئی تڑپ بھی نہ سکتا ہوگا۔ کوئی کراہتا ہوگا کوئی کراہ بھی نہ سکتا ہوگا۔(۵۹)

ان میں سے بعض زخمی بعد میں جاں بحق ہو گئے، کچھ معذور اور لا تعداد مہینوں تک ان زخموں کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے۔ ان مظالم کے ردعمل میں پورے ہندوستان کے مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ بعض غیر مسلم تنظیموں نے بھی اس سانحے پر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ شدید غم و غصے اور ہیجانی کیفیت کا اندازہ اس دور میں شائع ہونے والے مضامین، مراسلات اور شعرا کی تخلیقات سے لگایا جا سکتا ہے جو ''الہلال''، ''زمیندار''، ''ہمدرد'' اور دیگر اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ ایک مراسلہ نگار خان محمد قریشی نے ان مظالم کو نازیوں کے مظالم سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھا کہ:

افسوس! اے کان پور کے شہیدو! ..... تمھاری نعشوں کو پھولوں کی چادر نصیب نہ ہوئی ..... یاد رکھو کہ تمھارے بھائیوں کے دلوں پر تمھارے یوں چلے جانے سے جو کاری زخم لگا ہے وہ ہمیشہ ناسور بنا رہے گا۔ مسٹر ٹائلر [کذا] کی دھواں دھار بوچھاڑ اور ان کی سنگینوں کی چمک بجلی کی طرح مدتوں تک ان کے کانوں میں گونجتی اور آنکھوں میں چمکتی رہے گی۔(۶۰)

اس خونیں سانحے کے بعد پولیس کی جانب سے گرفتاریوں کا لامتناہی سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ بڑی تعداد میں لوگوں کو گرفتار کر کے پابند سلاسل کیا گیا۔ تمام سرکردہ علما گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا آزاد سبحانی کے علاوہ نظامی پریس کے مالک ابو سعید اور مولانا فیض الحسن گنگوہی بھی گرفتار ہونے والوں میں شامل تھے۔(۶۱) عام قیدیوں میں بوڑھے اور جوانوں کے ساتھ ساتھ کم عمر بچے بھی شامل تھے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ مسٹر ٹیلر کی ایما پر کم عمر بچوں پر بغاوت کے مقدمات قائم کیے گئے۔(۶۲) گرفتار شدگان میں ۱۰۶ لوگوں پر ۱۴ اکتوبر تک مقدمات چلتے رہے۔(۶۳) کچھ کم عمر لوگوں کو اس سے قبل ہی رہا کر دیا گیا۔ ''الہلال'' میں وقتاً فوقتاً ان رہا کیے گئے بچوں کی تصاویر بھی شائع ہوتی رہیں۔ مثلاً ۱۳ ستمبر ۱۹۱۳ء کو رہا کیے گئے ان گیارہ معصوم بچوں کی تصاویر ۲۴ ستمبر والے پرچے میں شائع ہوئیں۔(۶۴) اس کے علاوہ ۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو بھی رہا ہونے والے ان ۲۴ بچوں کی تصاویر شائع ہوئیں جنھیں ۱۳ اگست کے خونیں سانحے کے بعد گرفتار کیا گیا تھا۔ تصویر کے کیپشن میں سہواً بچوں کی تعداد ۴۰ درج کر دی گئی ہے۔ جب کہ اصل تصویر میں ۲۴ بچے موجود ہیں۔ یہی تعداد درست بھی ہے کیوں کہ اسی پرچے کے سرورق پر بھی یہی تصویر موجود ہے جس میں واضح طور پر بچوں کی تعداد ۲۴ درج ہے۔ ''الہلال'' کے اسی شمارے میں مسجد کے صحن اور محراب کا تصویری منظر بھی دکھایا گیا ہے جس میں خون کے دھبے واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ متنازع منہدم حصے کی تصویر بھی موجود ہے جس کو ڈھانے کے بعد ہتھیاروں سے لیس سرکاری اہلکار مستعد کھڑے دکھائی دے رہے ہیں۔(۶۵) یکم اکتوبر کے ''الہلال'' میں بھی خون کے چھینٹوں سے بھرے صحن کے علاوہ ۱۳ ستمبر کو رہائی پانے والے

گیارہ اور آخری دن رہائی پانے والے ان چار لڑکوں کی تصاویر بھی شائع ہوئیں۔(۶۶)

''ہمدرد'' میں بھی اس سانحے کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ شائع ہوتی رہی۔ غرض کہ اس زمانے کے اخبارات و رسائل نے ان واقعات کو بھرپور انداز سے پیش کیا تاکہ مسلمانوں کے جوش و جذبے کو ابھارا جا سکے۔ اخبار ''آزاد'' کان پور نے بھی عدالت کی کارروائی اور مستند اور مفصل حالات شائع کرنے کا بھرپور اہتمام کیا۔ اس بابت اس اخبار کے اشتہارات وقتاً فوقتاً ''الہلال'' میں بھی شائع ہوتے رہے۔(۶۷) ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت خصوصاً سرکردہ رہنماؤں نے ان مجروحین اور گرفتار شدگان کی مالی اعانت کا بیڑہ اٹھایا۔ خواجہ حسن نظامی نے اس سانحے پر ''کان پور کی خونیں داستان'' کے عنوان سے ۳۱ صفحات پر مشتمل کتابچہ تحریر کیا جس کے سرورق پر یہ اعلان بھی کیا کہ اس تصنیف کا نفع مظلوموں کے لیے قائم کردہ فنڈ میں جمع کیا جائے گا۔(۶۸) مولانا محمد علی طبیب سیشن جج صوبہ ورنگل علاقہ نظام نے ۵ روپے کی تا حیات اعانت ماہانہ دینے کے ساتھ ساتھ اس سانحے کے متاثرین کے لیے کوئی فنڈ قائم کرنے کا مشورہ دیا۔(۶۹) مظہر الحق نعمانی ردولوی نے یکم اکتوبر کے مراسلے میں چندہ مہم چلاتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کو مخاطب کیا اور کہا کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں نے ایک پیسہ فی نفر کے حساب سے بھی متاثرین کان پور کی مدد کی تو دس لاکھ ترانوے ہزار سات سو پچاس روپے جمع ہو سکتے ہیں۔(۷۰) اسی طرح ''انجمن دفاع مسجد مقدس کان پور کلکتہ'' کے نام سے ایک الگ انجمن قائم کی گئی، جس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد، سیکریٹری آنریبل فضل حق اور مسٹر اے۔ رسول ایم۔ اے۔ بیرسٹر لا کو خزانچی مقرر کیا گیا۔ ٹاؤن ہال کلکتہ میں اس مجلس کا پہلا اجلاس مورخہ ۱۹ اکتوبر کو منعقد ہوا۔ اس مجلس کے تحت ہر شہر میں ''دفاعِ مسجد کان پور'' کے نام سے مجالس قائم کی گئیں۔ وفود بنا کر وائسرائے ہند اور انگلستان تک اس سلسلے کے لیے آواز بلند کرنے کا اعادہ کیا گیا۔(۷۱) عام مسلمانوں کا جذبہ ایثار دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ''ہمدرد'' کے نمائندہ خصوصی نے عید کے موقع پر ہونے والے اس اجلاس کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا کہ ۱۹ ستمبر ۱۹۱۳ء کو کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مجمع اس قدر زیادہ تھا کہ چندے کی رقم لینے اور رسیدیں کاٹنے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ محلے محلے کے لوگ جوق در جوق آتے تھے اور اپنی اپنی مسجدوں اور گھروں سے جمع کیا ہوا چندہ، پیسے، اکنّیاں، دونیاں وغیرہ لا کر لجاجت اور انکسار کے ساتھ پیش کرتے۔ صاحبِ استطاعت لوگ اپنے بچوں کی عیدیوں کی معقول رقمیں شہدا اور مجروحین کے بچوں کے لیے پیش کرتے تھے۔ احساسِ قومی کا یہ حال تھا کہ شام کے وقت کچھ برقعہ پوش طوائفیں بھی چندہ جمع کرنے کے لیے وہاں پہنچیں۔(۷۲) نواب وقار الملک جیسے انگریز دوست اصحاب نے بھی اس فنڈ میں دل کھول کر حصہ لیا۔(۷۳) اس بابت سر رضا علی نے تو یہ بھی کہا کہ وقار الملک نے مہاراجا صاحب محمود آباد اور مولوی عبدالباری فرنگی محلی کے دوش بدوش اس موقع پر رہبری کا فریضا بھی انجام دیا۔(۷۴)

ملکی سطح پر اس مہم کا یہ فائدہ ہوا کہ ہندوستان کے مختلف شہروں سے ہزاروں روپے کی رقم جمع ہوئی۔ اس حوالے سے سرکردہ علما اور عوام و خواص کی وہ فہرست جنھوں نے دفاع مسجد کان پور کے تحت مالی تعاون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا،

''الہلال'' کے مختلف شماروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔[۷۵] ۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں بھی چندہ دینے والوں کی طویل فہرست شائع ہوئی۔[۷۶] لوگوں نے دوسرے شہروں سے بھی منی آرڈر ارسال کر کے خطیر رقم روانہ کی۔[۷۷] اس سلسلے میں لوگوں کی تجاویز اور آرا بھی شامل ہوتی رہیں۔ مثلاً وکیل محمد علی افسوس نے لکھا کہ جو چندہ وصول کیا جا رہا ہے، وہ صرف مقدمے کے لیے اور بیرون ملک بھیجے گئے وفود کے اخراجات پر خرچ ہوتا ہے۔ کچھ پیسہ تجارت میں لگا کر اس کا منافع اس سانحے کے متاثرین کو دینے کا بندوبست کیا جائے تو بہتر ہوگا۔[۷۸] سید احمد حسین کے مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء تک کان پور کے فنڈ میں تقریباً ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم محفوظ ہوگئی۔[۷۹] بعض اصحاب نے جمع کی گئی رقم سے متعلق سوالات بھی اٹھائے۔[۸۰] مولانا نجم الدین ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر نے بچی ہوئی رقم کو جنوبی افریقہ کے مصیبت زدہ مسلمانوں پر خرچ کرنے کا مشورہ بھی دے ڈالا۔[۸۱] حالانکہ سر علی رضا نے اپنی تقریروں میں چندے کی رقم کے مصارف میں واضح طور پر کہا کہ یہ رقم پسماندگان شہدائے کان پور، مجروحین اور ملزمین کی پیروی میں خرچ کی جائے تو بہتر ہے۔ اس کے علاوہ مسجد کو واپس لینے کے لیے جو قانونی چارہ جوئی پر رقم خرچ ہو، وہ بھی اسی چندے کی رقم سے ادا کی جائے۔[۸۲]

ان ملزمین کے مقدمات کا اختتام ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو ہوا جب وائسرائے مچھلی بازار کے معائنے کے لیے آئے۔ مسلم اکابرین ان کے ہمراہ تھے۔ مسٹر لائل، سیشن جج کی آمد کے وقت بہ کثرت لوگ موجود تھے۔ دفعہ ۴۹۴ تین درخواستیں فوج داری کی سماعت ہونا مقصود تھی۔ عدالت نے مسٹر مظہر الحق سے دریافت کیا کہ بہ لحاظ چند وجوہات گورنمنٹ کو ان مقدمات کو چلانا منظور نہیں، آپ کو ان درخواستوں پر تو کوئی عذر نہیں؟ جواب میں مسٹر مظہر نے بہ خوشی اس بات کو قبول کر لیا۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ مسٹر مظہر الحق، راجہ صاحب محمود آباد نے خصوصاً اور دیگر قانون پیشہ افراد نے اس سانحے کے موقع پر عموماً اپنا قومی فریضہ پوری تندہی سے ادا کیا۔[۸۳] ڈاکٹر وقار احمد رضوی کے مطابق علامہ اقبال بھی مقدمہ لڑنے کانپور گئے۔[۸۴] لیکن اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ بعد میں سرمایہ مسجد جو اس وقت مبلغ نوے ہزار روپے نقد مسٹر مظہر الحق کی تحویل میں تھا، کی بابت یہ رائے ظاہر کی گئی کہ اس سرمائے سے کان پور میں ایک اسلامیہ اسکول جس کے ساتھ ایک جامع مسجد بھی ہو، اس بے نظیر قومی ایثار کی یاد میں قائم کر دیا جائے۔[۸۵]

سانحہ مسجد کان پور بہ ظاہر کوئی غیر معمولی نوعیت کا واقعہ معلوم نہیں ہوتا لیکن یہ سانحہ تاریخ ساز اہمیت کا حامل ضرور ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی فکری، سیاسی اور ملی شعور کی تاریخ میں یہ سانحہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ حادثہ رونما نہ ہوتا تو شاید ایک عرصہِ دراز تک مسلمانوں میں فرنگی سامراج سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا نہ ہوتا۔ وہ بزدلی، نیازمندی اور غیر مشروط اطاعت کی زندگی بسر کرتے رہتے، لیکن اس سانحے نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ خواب خرگوش سے جاگ اٹھے۔ ان میں مرنے اور مٹنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ سنگینوں کے سامنے وہ سینہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔ گولیاں انھوں نے پیٹھ پر نہیں دل پر کھائیں۔ خاک و خون میں تڑپے اور جام شہادت نوش کر کے حیات جاودانی حاصل کر لی۔ ہندوستان کی تاریخ

میں اس وقت تک کسی اور واقعے نے انھیں اس قدر بیدار نہیں کیا تھا جتنا اس واقعے نے کیا۔ کسی بات سے بھی ان میں اتنی جرات پیدا نہیں ہوئی جتنی اس سانحے سے پیدا ہوئی۔ مسجد کان پور کے سلسلے میں مسلمانوں کا قید و بند اور دار و رسن کا معاملہ اس جہاد، بے داری اور شعور کا محرک بنا جو تحریک خلافت کی صورت میں پوری دنیا کے سامنے آیا۔(۸۶)

قریہ قریہ شہر شہر اس مسئلے میں جو جلسے منعقد ہوئے اس نے حکمرانوں کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ مسلمان مشاہیر کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔ لکھنؤ میں ہونے والے جلسے کو تو زبردستی لیفٹیننٹ گورنر کے حکم سے زبردستی پابندی لگوادی گئی۔(۸۷) اس کے علاوہ ۵ اگست ۱۹۱۳ء(۸۸) کو ریسٹورنٹ اسکوائر لندن میں ہندوستانی مسلمانوں کا ایک غیر معمولی جلسہ ہوا جس میں مسجد کان پور کی زمین واپس دے کر دوبارہ سے مسجد کی تعمیر کا مطالبہ کیا گیا اور متاثرہ خاندانوں سے تعزیت کی گئی۔(۸۹) اسی طرح حکومتی پروپیگنڈے کا موثر جواب دینے میں مسلمان کافی حد تک کامیاب رہے۔ حکومت نے یہ سمجھا تھا کہ مسلمان ہر اعتبار سے پس ماندہ ہیں۔ غدر میں انھیں اس قدر کچلا اور تباہ و برباد کیا جا چکا ہے کہ ان میں حکومت سے ٹکر لینے کی سکت نہیں رہی۔(۹۰) انھوں نے اس حادثے کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے مختلف طرح کے اعلانات اور بیانات حکومت کے منظور نظر اخبارات میں شائع کروائے۔ اس سلسلے میں ''پانیر'' کی روش دیکھیے، لکھتا ہے کہ ''اس کارروائی (انہدام مسجد) کے بعد یہ معاملہ جو کچھ عرصے سے زیر بحث ہے، ختم ہو جائے گا۔''(۹۱) ہمدرد نے اس کے جواب میں لکھا کہ ''پانیر کو یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمان اس مذہبی دست اندازی کو ہرگز نہیں بھول سکتے۔ یہ ایک خار ہے جو ان کے سینے میں چبھ رہا ہے اور چبھتا رہے گا، جب تک منہدم شدہ حصہ پہلی صورت میں نہ بنا دیا جائے۔''(۹۲) غرض کہ اس خونیں سانحے نے تمام ہندوستان کو خونیں بنا دیا۔ آتش بیاں مقرروں، شعلہ فشاں محرروں اور شعلہ نفس شاعروں نے مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی تھی۔(۹۳) اب تک مسلمانوں نے مسجد کے منہدم حصے کی دوبارہ تعمیر سے متعلق جتنے مطالبات کیے وہ رد کیے جا چکے تھے۔ جتنی عرضداشتیں پیش کیں، انھیں مسترد کر دیا گیا تھا اور جتنی فریادیں کی گئی تھیں انھیں مستحق سماعت نہیں سمجھا گیا تھا۔ بالآخر راجا سر علی محمد خان محمود آباد کی قیادت میں ایک وفد مرتب کیا گیا۔ اس وفد نے ایک میمورنڈم لکھا جس میں ارکانِ وفد مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی، آنریبل راجا میر امیر جعفر، تعلقہ دار، پیر پور، نواب محمد اسحاق خان، نواب مزمل اللہ خان آف بھیکم پور، آنریبل مسٹر عبدالرؤف سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ، آنریبل مسٹر شاہد حسین تعلقہ دار، آنریبل خواجہ غلام الثقلین، آنریبل سر رضا علی، مسٹر سید نبی اللہ بیرسٹر لا آگرہ، نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولوی محمد نسیم ایڈووکیٹ اور منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوروی کے دستخط بھی تھے۔ اس میمورنڈم میں عام واقعات کی تفاصیل بیان کرنے کے بعد آخر میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ مسجد کے منہدم حصے کو دوبارہ تعمیر کر دیا جائے۔(۹۴) لیکن جیمس مسٹن پر ان مشاہیر علم و ادب اور مسلم رہنماؤں کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہا۔ غالباً اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ''منہدم مسجد کی دوبارہ تعمیر سے حکومت کی کمزوری ثابت ہوگی۔''(۹۵) بلکہ اس نے اس وفد پر زور زبردستی اپنی بات منوانے کا الزام بھی لگایا جس کے جواب میں ''ہمدرد'' نے لکھا کہ:

اگر ہز آنر کا اشارہ اسی زور و زبردستی کی طرف ہے جس کے مقابلے میں حکومت برطانیہ
کے نمائندے کی حیثیت سے سوار اور پیدل فوج اور بے شمار پولیس لا کھڑی کرنا اپنے
اقتدار کے لیے ضروری سمجھتے ہیں تو ہم نہیں کہہ سکتے یہ اقتدار کب تک قائم رہے گا؟[۹۶]

اس خونیں سانحے نے بہ قول سید سلیمان ندوی ''تمام ہندوستان کو خونیں بنا دیا تھا۔''[۹۷] اس معرکے میں مسلمانانِ کان پور نے انگریز تسلط کی صد سالہ تاریخ میں پہلی بار بے پناہ عزم اور ولولے کا مظاہرہ کر کے جنوبی ایشیا میں فرنگیوں کی حکومت کی بنیادیں ہلا دیں۔[۹۸] سیاسی اعتبار سے یہ معرکہ جنوبی ایشیا میں انگریزی اقتدار کے خلاف کھلی محاذ آرائی کے طور پر سامنے آیا اور اہلِ ہند پر یہ بات آشکار ہو گئی کہ انگریزی حکومت کا غلبہ ناقابلِ تسخیر نہیں ہے۔[۹۹] عوام کے جذبات مشتعل ہوئے تو ملک کے طول و عرض میں شدید بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ کہنے کو تو یہ ایک مسجد کا واقعہ تھا لیکن اس کی تہہ میں آزادی اور حریت پرستی کا جذبہ کام کر رہا تھا۔[۱۰۰]

(۲)

یہ واقعہ اس اعتبار سے بھی یادگار ہے کہ برطانوی ملوکیت کے دور میں پہلی مرتبہ شہری رعایا کے قتلِ عام کی نوعیت رکھتا ہے۔[۱۰۱] اس دور کے مسلم ادب کا تفصیلی جائزہ لیں تو ہندوستان میں مسلمانوں کی جگر سوزی اور غمگینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مقدمات چلے، چندے جمع ہوئے، پورے ہندوستان میں مسلمانوں نے ہر طرف اس الم ناک واقعے پر احتجاجی تحریک چلائی، مگر برطانوی حکومت نے پہلے سے بھی زیادہ سرد مہری دکھائی۔[۱۰۲] اس دور کے بہت سے اہلِ قلم نے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ سید سلیمان ندوی کے مضمون ''مشہد اکبر'' کا ذکر اوپر آ چکا ہے جس پر ''الہلال'' کی ضمانت ضبط ہوئی تھی اور اس کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کامیاب مضمون پر سید سلیمان ندوی کو مبارک باد کا تار دیا تھا۔ مسلمانوں کے جوش و خروش اور انگریزی حکوت کے خلاف نفرت کے اظہار کا اندازہ خواجہ حسن نظامی کی اس تقریر سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ۷ اگست کو بعد نمازِ جمعہ میرٹھ کی جامع مسجد میں کی تھی۔ اس تقریر میں ان کا لہجہ دیکھیے:

کیا یہ لوگ مسلمانوں کا جوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر ان سے کہہ دو کہ ہمارا جوش فیشن اور نمائش کا جوش نہیں ہے۔ ہم جب جوش میں آتے ہیں تو آسمان تھرّا جاتا ہے، سمندر ڈر کے مارے سمٹ جاتا ہے، پہاڑ پست ہو جاتے ہیں، دریاؤں کی روانی رُک جاتی ہے اور ہمارا جھنڈا جب بلند ہوتا ہے تو سینٹ پال کے گرجا کے سوا کہیں نصب نہیں ہوتا۔ ہماری مسجد کو بنا دو، ہمارے قیدیوں کو چھوڑ دو، ہمارے زخمیوں کو ہمارے حوالے کر دو۔[۱۰۳]

بعد میں اس موضوع پر حسن نظامی کی کتاب ''کان پور کی خونیں داستان'' میرٹھ سے ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی۔[۱۰۴]
شبلی نے متعدد نظمیں اس سانحے سے متاثر ہو کر لکھیں۔ مولانا شبلی نے اس سانحے پر جو پُر جوش نظمیں لکھیں، وہ اس قدر پُر اثر ہوتیں کہ جس ہفتے ''الہلال'' کلکتا یا ''ہمدرد'' دہلی یا ''زمیندار'' لاہور میں چھپتیں، ہندوستان کے کونے کونے تک اسلامی جوش و

جذبے میں اضافے کا باعث بنتیں۔[۱۰۵] ان شاہکار نظموں میں ''ہم کشتگانِ معرکہِ کان پور ہیں'' پہلی نظم ہے جس میں جوش و خروش کا ایک نہ رکنے والا طوفان نظر آتا ہے۔ اس خونیں واقعے کی منظر کشی کرتے ہوئے شبلی کہتے ہیں کہ:

کل مجھ کو چند لاشہِ بے جاں نظر پڑے
کچھ طفل خوردسال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
کچھ نوجواں ہیں، بے خبرِ نشہِ شباب
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادہِ فنا
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چُور ہیں
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں
ہم کشتگانِ معرکہِ کان پور ہیں[۱۰۶]

یہ نظم سوز و گداز کے لحاظ سے اردو کی بہترین نظموں میں شمار کی جاسکتی ہے۔[۱۰۷] شبلی نے جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے استعفیٰ دیا تھا اور اس کے چند روز بعد ہی مسجد کان پور کا سانحہ رونما ہوا۔ یہ ایسا سانحہ تھا جس نے طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں سے بھی زیادہ جوش پیدا کیا ہوا تھا۔ اس زمانے میں مولوی عبدالکریم کے واقعے سے طبقۂ احرار میں شبلی کی ساکھ پر منفی اثر پڑا تھا۔ لہٰذا مسجد کان پور کے سانحے سے شبلی کو ایک بار پھر موقع ملا کہ وہ پھر سے ان حلقوں میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ اس وقت تک ان کی سیاسی نظمیں ''کشاف''، ''نقاد'' یا اس طرح کے فرضی ناموں سے شائع ہوتی تھیں۔ اب انھوں نے اعلانیہ اپنے نام سے نظمیں شائع کروائیں۔[۱۰۸] یہ نظمیں جوش و جذبے کو پیدا کرنے میں پہلے سے زیادہ موثر ثابت ہوئیں۔ اپنی ایک نظم ''علمائے زندانی'' میں کہتے ہیں کہ:

مساجد کی حفاظت کے لیے پولس کی حاجت ہے
عجب کیا ہے کہ اب ہر شاہ راہ سے یہ صدا آئے
پنہائی [کذا: پہنائی] جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہی دس بیس اگر [کذا: گر] ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
شہیدانِ وفا کے قطرہِ خوں کام آئیں گے
عجب کیا ہے جو نو خیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
خدا کو آپ نے مشکور فرمایا عنایت ہے
مجھے بھی کم سے کم اک غسل خانے کی ضرورت ہے
یہ زیور ''سیدِ سجاد عالی'' کی وراثت ہے
تو مجھ کو سُستیِ بازوئے قاتل کی شکایت ہے
عروسِ مسجدِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے (۱۰۹)

سیاسی مسائل کے بیان میں شبلی جذبات سے کبھی علاحدہ نہ ہو سکے۔ کان پور کے اس سانحے کا سن کر بھی شبلی کو اپنے برسرِ زمین موجود نہ ہونے کا بے حد افسوس تھا۔ (۱۱۰) ان نظموں کا طنز اور اشتعال انگیزی مسلمانوں میں قومی غیرت وحمیت کا سبب تو بن ہی رہی تھی اس کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا بھی زبردست مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ جوشِ بیاں اور جرات گفتار کی ایسی مثالیں اس دور کی اردو شاعری میں کم ہی ملیں گی۔ مسٹر جیمس مسٹن اور مسٹر بٹلر جو اس واقعے میں براہ راست ملوث تھے۔ ان کو للکارتے ہوئے وہ اپنی ایک نظم ''آپ ظالم نہیں زنہار پہ ہم ہیں مظلوم'' میں کہتے ہیں کہ:

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا، نہ اب ہے انکار
یہ بھی تسلیم ہے ہم کو کہ یہ جو کچھ کہ ہوا
آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو
یہ حقیقت بھی مگر قابلِ انکار نہیں
گولیاں کھا کے جو گرتے تھے جوانانِ حسین
گولیوں کے تھے نشاں منبر و محراب پہ بھی
جا بجا خون سے مسجد ہے نگاریں اب تک
پا بہ زنجیر تھے مجرم بھی تماشائی بھی
واقعہ یہ ہے غرض، کوئی نہ مانے نہ سہی
کہ ہر اک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم
اس میں ملحوظ رہے عدل کے آداب و رسوم
فیر [کذا: فائر] کا حکم دیا آپ نے جب بہرِ نجوم

کہ بیک چشم زدن موت کو تھا اذنِ عموم
سب یہ کہتے تھے ''قیامت ہے کہ جھڑتے ہیں نجوم''
بس کہ درکار ہیں مسجد کے لیے نقش و رسوم
یہ وہ صنعت ہے کہ تا حشر نہ ہو گی معدوم
اور پولس کو یہ تھا عذر کہ ''ہم ہیں محکوم''
آپ ظالم نہیں زنہار، پہ ہم ہیں مظلوم(۱۱۱)

مسلمانوں کے اس قتلِ عام نے شبلی کو خون کے آنسو رلائے۔ طرابلس اور بلقان کے شہدا ہوں یا کان پور کے، شبلی نے ان سب کے لیے آنسو بہاتے ہوئے کہا کہ:

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسول عربؐ کی قوم
سن لو وہ گنج ہائے گراں مایہ دفن ہیں
کیوں گھٹ رہی ہے آج عدو میں ظہور میں
کچھ بیلقاں کی خاک میں کچھ کان پور میں(۱۱۲)

بلقان کے معرکے کے بعد کان پور کا سانحہ جگر خراش دونوں نے شبلی کو بے چین کر رکھا تھا۔ جو لوگ اس خونیں واقعے میں زخمی ہوئی تھے شبلی ان سے اظہار یک جہتی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرہِ خوں
اگرچہ صدمہِ بلقان سے جگر شق ہے
کہ کان پور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے(۱۱۳)

اسی طرح جو لوگ اس سانحے کے بعد گرفتار ہوئے اور انھیں پابند سلاسل کیا گیا، ان میں علما بھی تھے اور عام لوگ بھی، ان سے آواز ملاتے ہوئے شبلی اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہیں۔ دراصل ۱۷ مئی ۱۹۰۷ء کو قیام اعظم گڑھ کے دوران بہو کی غلطی سے بندوق چل جانے کی وجہ سے شبلی کو اپنے ایک پیر سے محروم ہونا پڑا۔ کارتوس میں اگرچہ چھرّے تھے مگر اس قدر قریب سے چلی تھی کہ ان کے ٹخنے کی ہڈی بری طرح چور چور ہو گئی اور عمل جراحی کے ذریعے نصف پنڈلی کو جدا کرنا پڑا۔(۱۱۴) اس بے بسی کی صورتِ حال میں بھی شبلی علمائے کان پور کے شانہ بشانہ چلنا چاہتے تھے، لیکن معذوری ان کے آڑے آ رہی تھی۔ اس حالت کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہے دشوار
پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ
ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں
یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں[۱۱۵]

اس کے علاوہ ''تقسیمِ عمل''، ''وضو خانہ'' اور ''کان پور میونسپلٹی کا خطاب مسجد مچھلی بازار کان پور سے''[۱۱۶] کے عنوان سے انھوں نے فارسی نظمیں بھی کہیں اور جب اس مسجد کے متنازعہ حصے پر حکام اور مسلمانوں میں صلح کی شرائط طے ہوگئیں تو ''شرائط صلح'' کے نام سے بھی ایک نظم لکھی اور اس نظم میں حکام کی جانب سے کیے فیصلوں کو سخت تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔ ان کی یہ نظم ''الہلال'' میں شائع ہوئی[۱۱۷] تو لوگوں نے شبلی کے نقطۂ نظر کو خوب سراہا۔

سر علی امام جو اسی زمانے میں وائسرائے کی کونسل کے رکن تھے، انھوں نے ہی مولانا محمد علی جوہر کو اور ان کے ذریعے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو مصالحت کا پیغام بھیجا تھا۔ اس گفت وشنید کا یہ نتیجہ نکلا کہ ملزموں سے مقدمہ اٹھا لیا جائے گا، مظلوموں کو مالی امداد دی جائے گی لیکن مسجد کے منہدم حصے کو اسی طرح چھوڑ دیا جائے گا۔ مسلمان اس کے دوبارہ تعمیر پر اصرار نہ کریں۔[۱۱۸] اس پس منظر میں لکھی گئی نظم ''شرائط صلح'' کا انداز ملاحظہ کیجیے:

لوگ کہتے ہیں کہ حکام ہیں آمادۂ صلح
لیکن انعام گراں قدر و وظائف کی طمع
مایۂ بحث اگر ہے، تو فقط مسجد ہے
داد خواہِ حقِ مسجد ہیں اسیرانِ جفا
آپ کہتے ہیں ''وضو خانہ تھا، مسجد تو نہ تھی''
بند کرتے ہیں جو یہ آپ جرائد کی زباں
داد خواہوں سے ہز آنر نے جو ارشاد کیا
ہم اسیرانِ محبت سے یہی ہے جو سلوک
یہ اگر سچ ہے تو جز خوبیِ تقدیر نہیں
یہ حقیقت میں کوئی صلح کی تدبیر نہیں
دیّتِ قتلِ شہیدانِ جواں میر نہیں
ورنہ ان کو گلۂ سختیِ تقدیر نہیں

یہ بجا مسئلہ فقہ کی تعبیر نہیں
یہ بھی کچھ مانعِ آزادیِ تحریر نہیں
کہ ''یہ حکم ازلی قابلِ تغییر نہیں''
پھر نہ کہیے گا کہ فتراک میں نخچیر نہیں[۱۱۹]

مسلمانوں کے تمام طبقات نے اتحاد و اتفاق کے ساتھ حکومت کی اس غیر منصفانہ پالیسی کے خلاف محاذ قائم کیا۔ آخر کار وہ اس طے شدہ، نا قابل تنسیخ فیصلے کو بدلنے پر آمادہ ہوگئی۔ ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ بہ نفس نفیس کان پور تشریف لائے۔ سر علی امام حکومت ہند کی طرف سے اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے مسلمانانِ ہند کی طرف سے گفت وشنید شروع کی۔[۱۲۰] بالآخر تمام معاملات طے پا گئے۔ قیدیوں کو رہا کر دیا گیا، مقدمات واپس لے لیے گئے اور مسجد کا وہ حصہ جو منہدم کر دیا گیا تھا، پھر سے تعمیر کر دیا گیا۔ یہ تعمیر کچھ اس انداز سے کی گئی کہ چھت کے نیچے سے سڑک نکال کر آمد و رفت کی جگہ بنائی گئی اور اوپر کے خانے میں وضو خانہ قائم کر دیا گیا۔[۱۲۱] اس طرح یہ فیصلہ سب کو منظور ہوا۔ مولانا شبلی نے وائسرائے کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے اپنی شکر گزاری کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا:

اے ہمایوں گہر و افسرِ اورنگِ شہی
تونے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست
تیرے لطف و کرمِ عام نے دے دی یہ ندا
تونے اک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا
گرچہ مدحِ امرا میں نے نہیں کی ہے کبھی
تیرے دربار میں پہنچیں گے جو اوراقِ سپاس
وہ کیا تو نے جو آئینِ جہاں بانی ہے
یہ حقیقت میں ظفر مندیِ سلطانی ہے
کوئی مجرم ہے نہ قیدی ہے نہ زندانی ہے
بازوؤں میں یہ ترے زورِ جہاں بانی ہے
شکرِ احسان مگر فطرتِ انسانی ہے
ان میں یہ پیشکشِ شبلیِ نعمانی ہے[۱۲۲]

اکبر الہ آبادی نے اس زمانے کے اہم سیاسی و سماجی مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ مسجد کان پور کے سانحے پر ان کے ہاں علاحدہ سے تو کوئی نظم نہیں ملتی لیکن اس زمانے میں کہی گئی نظم کا ایک مصرع

بحمد للہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے (۱۲۳)

میں ''خون شہیداں'' کی تلمیح کو اس جانب اشارہ سمجھا گیا۔ مسجد کان پور میں گولی چلنے اور مسلمانوں کی شہادت کے واقعات چوں کہ ان ہی دنوں رونما ہوئے تھے لہٰذا اکبر کو بھی اس شبہے میں گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں اکبر کو شعر گوئی سے کنارہ کش ہونے کا اعلان بھی کرنا پڑا جس کے بعد گلو خلاصی ہوئی لیکن یہ بھی عارضی ثابت ہوئی۔ (۱۲۴) اکبر کو سامراجی قوتوں کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم پر غم و غصہ ضرور تھا لیکن انھوں نے سانحہ مسجد کان پور سے متعلق کچھ احتیاط سے کام لیا۔ اس کے باوجود ان کی غزلوں میں بعض اشعار براہ راست موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

یہ سڑک کس سمت میں آخر نکالی جائے گی
خود پرستوں کو مبارک ہو یہ ایوانِ رفیع
آنے والی نسل کس سانچے میں ڈھالی جائے گی
دل شکستوں میں کوئی مسجد بنا لی جائے گی (۱۲۵)

انگریزوں کی ہٹ دھرمی اور آمرانہ رویّے کے خلاف بھی اکبر نے بہت لکھا۔ مسلم رہنماؤں کی طرف سے ہونے والی مراسلت اور مسئلے کے حل کی جانب کی جانے والی کوششوں کے باوجود جب اس مسئلے کو طاقت کے بل بوتے پر حل کرنے کی کوشش کی گئی تو اکبر نے طنزاً کہا کہ:

گولیوں کے زور سے کرتے ہیں دنیا کو ہضم
اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں (۱۲۶)

اس حوالے سے اکبر کے وہ اشعار بھی اہمیت کے حامل ہیں جو انھوں نے خواجہ حسن نظامی کو اگست ۱۹۱۳ء میں ارسال کیے۔ ''سب سے آخری شکوہ'' کے عنوان سے یہ نظم ''کان پور کی خونیں داستان'' میں شامل ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اونٹ نے برگڈ میں کل گردن اٹھائی تھی مگر
وہ یہ سمجھا تھا مسلّم ہیں ہماری نیکیاں
منزلِ مقصود اس کی سجدہ گاہِ خلق تھی
آپ نے برسائیں اس پر گولیاں ہر سمت سے
یا الٰہی ہم غریبوں کا کہاں ہو اب پناہ
ہو چکی تھی اس کو کمرایٹ میں اک مدت دراز
خوش دلی سے آپ فرمائیں گے اس کو سرفراز
وہ تو تھا اک بارِ کش اور سالکِ راہِ حجاز

آپ اسے گردن کشی سمجھے جو تھا اک پاکباز
دشمنِ اشتر ہوئے ہیں حضرتِ انجن نواز[۱۲۷]

مولانا ظفر علی خان کی طنزیہ شاعری کی حدود بھی اتنی ہی وسیع ہے جتنی کہ بیسویں صدے کے ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی، افراد، جماعتیں، ادارے اور تحریکیں سب ہی ظفر علی خان کی طنزیہ شاعری کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ سیاسی اداروں میں انگریزی حکومت اور اس کے کاسہ لیس ہمیشہ ان کے طنز کا نشانہ بنے رہے۔[۱۲۸] اور ہمیشہ ہی انھوں نے آزادی کے متوالوں اور اس راہ میں اپنی جانیں قربان کرنے والوں کو خوب سراہا۔ اپنی ایک نظم ''فانوس ہند کا شعلہ'' میں وہ شہدائے کان پور اور اس واقعے میں قیدی بنائے جانے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خون سے
مرحبا اے نوگرفتارانِ بیدادِ فرنگ
زندگی ان کی ہے، دین ان کا ہے، دنیا ان کی ہے
قصرِ آزادی کی آرائش کا ساماں ہوگئیں
جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہوگئیں
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہوگئیں[۱۲۹]

برصغیر پاک و ہند کی سیاست کا کوئی ایسا پہلو اور اس سے جڑا کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوگا جس پر مولانا ظفر علی خان نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ ان کی زندگی کا اوّلین مقصد اپنے وطن کو چمنستان بنانا تھا اور اس مقصد کے لیے وہ شہیدوں کے لہو کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ اس بابت ان کا کہنا تھا کہ:

وطن کو میں چمنستان بنا کے چھوڑوں گا
لہو شہید کا لوں گا اور اس کی سرخی کو
اور اس کی صبح کو خنداں بنا کے چھوڑوں گا
میں غازۂ رخِ ایماں بنا کے چھوڑوں گا[۱۳۰]

برطانوی استعمار کے خلاف وفادار مسلمانوں کا مذہبی جہاد کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ایک طرف جیمس مسٹن کی قہرمانیاں تھیں تو دوسری جانب مسلم زعما کی جدوجہد۔ کچھ عافیت پسند مسلمان مسئلے کو صلح و آشتی سے منطقی انجام تک پہنچانے کے حامی بھی تھے۔ اس سلسلے میں بھی جلسے جلوس جاری تھے۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو مراد آباد میں ہونے والے جلسے میں سر رضا علی کی تقریر بھی اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔[۱۳۱] اس موقعے پر مشہور عالم اور شاعر کیفی چڑیا کوٹی نے بھی ایک عمدہ قطعہ کہا۔ ملاحظہ کیجیے:

ابن مریم کو دور کی سوجھی
ملی فرصت تو حشر والوں کو
اور موسیٰؑ کو طور کی سوجھی
فتنۂ کان پور کی سوجھی(۱۳۲)

اس موقعے پر معروف شاعر حکیم آزاد انصاری بھی خاموش نہ رہ سکے۔ انگریزوں نے جو ظلم و جبر کا رویّہ اختیار کر رکھا تھا، اس پر عوام بہت نالاں تھے۔ مگر برطانوی حکمرانوں کو اس ناراضی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ رعایا کے جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس صورتِ حال کو آزاد انصاری نے شعری قالب میں ڈھالتے ہوئے کہا کہ:

رعایا حکومت سے نا خوش نہ ہو
مگر لاٹ صاحب کو پروا نہیں
اسی میں ہے مضمر حکومت کی زیست
بریں ملک داری بباید گریست(۱۳۳)

ہم دیکھتے ہیں کہ برطانوی حکمرانوں کے اس رویّے نے بعد میں انھیں کس قدر نقصان پہنچایا اور کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ملک میں ہر طرف ان کے خلاف ردعمل اور تحریک کو خوب بڑھاوا ملا۔

مصالحت کی کوششیں جب بارآور ثابت ہوئیں اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو وائسرائے بہادر شملہ سے اتر کر کان پور کی بستی پر جلوہ افروز ہوئے تو ''ہمدرد'' نے اس واقعے پر دلچسپ اور پُر لطف طنز کرتے ہوئے یہ شعر درج کیا کہ:

وہ آئے ہیں ہماری نعشیں پر آج
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے(۱۳۴)

مسجد کان پور کے سانحے کے بعد مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والی نظمیں اور قطعات بھی اس حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔ اس تنازعے کے تصفیے کے بعد بھی لوگوں نے واقعات کو شاعری کا موضوع بنایا۔ ۹ ستمبر ۱۹۱۴ء کو ''مسلمانوں کی فریاد'' کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی جس میں اس سانحے کے بعد متاثرین کی زندگی کیسی گزری، ان مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

کان پور میں خون بہا اور ملک میں بہتا پھرتا ہے
خون میں زخمی خوب نہائیں، تجھ کو کچھ پروا ہی نہ ہو
تو جو خدائی لے کر بیٹھا، آخر یہ کس کام کی ہے
بندوقوں سے جسم ہوا ہے چھلنی زخم رسیدوں کا

روتے روتے نور گیا سب بیواؤں کے دیدوں کا
باپ ہے بوڑھا، بیا زخمی، جینے کی کچھ آس نہیں
قومی بہنیں لاوارث ہیں، قوم کو کیا احساس نہیں
ہائے یتیمی! پڑ گئے اب تو جان کے لالے بچوں کو
کہنے کو تو لال ہے لیکن سب کچھ کہتا پھرتا ہے
جانیں مٹی میں مل جائیں، تجھ کو کچھ پروا ہی نہ ہو
گھر تیرا یوں ڈھایا، تجھ کو کچھ پیچ اپنے نام کی ہے
پھیلا ہے مقتل کی زمیں پر یہ خون شہیدوں کا
خون ہوا بے چارے کم سن لڑکوں کی امیدوں کا
بچہ بھوکا ننگا ہے اور کوڑی اس کے پاس نہیں
جیبوں میں سے کچھ بھی نہ نکلے، ایسا تو افلاس نہیں
رحم کرے قوم اور بچالے، موت نہ کھائے بچوں کو[۱۳۵]

حامد اللہ افسر کی نظم ''مسجد سے خطاب'' میں بھی مسلمانوں کے عبادت خانے کی اہمیت اور حرمت کو بیان کیا گیا ہے۔ پوری اسلامی دنیا میں مسجد کا جو احترام ہے اس کی بابت شاعر کا کہنا ہے کہ:

ساری دنیا میں حفاظت دل سے ہوتی ہے تری
زندگی تجھ پر فدا ہو یہ ہے اپنی زندگی
کچھ تیری تقدیس پہ دھبّا نہ آنے پائے گا
ہر جگہ یکساں تجھے حاصل ہے عز و افتخار
مسلمِ دل ریش کہلاتے ہیں تیرے جاں نثار
تو ہو بے حرمت کبھی ہم سے نہ دیکھا جائے گا[۱۳۶]

مسلمانوں کے مطالبات پورے ہونے کے بعد وائسرائے ہند کے لیے جو تہنیتی پیغامات کا سلسلہ شروع ہوا ان میں کچھ لوگوں نے منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ شبلی کی نظم کا حوالہ مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح کی ایک نظم سید قمر الدین احمد قمر سندیلوی نے ''تیرے ہی صدقے میں تو خان بہادر ہوں'' میں بھی ان ہی جذبات کا اظہار کیا۔[۱۳۷] ''کان پور کی خونیں داستان'' میں خواجہ حسن نظامی نے بعض ایسی نظمیں بھی نقل کی ہیں جن پر شاعر کا نام درج نہیں۔ لیکن یہ نظمیں بھی سانحہ کان پور کے تناظر میں اہمیت کی حامل ہیں۔ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان اور جذبات اسلام کے حامل شاعر جس کا

نام یہاں درج نہیں، کی نظم ''عشق بازوں کی سرفروشی'' میں بھی شاعر نے اس واقعے کے حوالے سے مسلمانوں کی کسمپرسی اور لاچاری کے باوجود ان کی سرفروشیوں اور قربانیوں کا تذکرہ کچھ ان الفاظ میں کیا ہے:

یہ مانا ہم میں وہ غیرت نہیں رہی باقی
یہ ہم نے مانا کہ ہم ننگ و عارِ ہستی ہیں
یہ ہم نے مانا کہ ہم ملک و قوم کھو بیٹھے
مگر ہم عہدِ کہن آج تازہ کرتے ہیں
ترے ہی نام کے خاطر لہو بہاتے ہیں
ہماری آرزوئے دل حصول ہو جائے
ہماری آج کی قربانیاں بھی یاد رہیں
تماشا آج ہے کچھ اپنی سرفروشی کا
نظارہ دیکھ لے تو بھی تو بے قراروں کا
ہمارے خوں میں حرارت نہیں رہی باقی
یہ ہم نے مانا کہ ہم وقفِ تن پرستی ہیں
ہم اپنی قوتِ بازو کو آج رو بیٹھے
دکھا دے جلوہ کہ پھر آج تجھ پہ مرتے ہیں
یہ سرفروش لیے اپنے سر کو آتے ہیں
یہ تحفۂ سرِ عاشق قبول ہو جائے
ہمارے خون کے قطرے نہ نا مراد رہیں
کرشمہ ہے یہ بنا تیری بے نیازی کا
ہجوم ہے درِ اقدس پہ جاں نثاروں کا (۱۳۸)

مسجد کے انہدام میں جس طرح انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا گیا، بالخصوص ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے مندر کو محفوظ اور مسجد کے وضو خانے کو شہید کیا گیا، انتظامیہ کے اس متعصّبانہ عمل سے مسلمانوں کے دل میں رنجش کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ اس کے خلاف جو ردِعمل ہوا، وہی اس سانحے کا سبب بھی بنا۔ اس پس منظر میں مختلف رسائل و جرائد میں اشعار، قطعات اور نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی اپنی تصنیف میں کچھ اشعار درج کیے ہیں۔ دیکھیے:

کھو گئی کان پور کی مسجد
بڑھ گئی دین سے وفا داری
رہ گئے بت اگر زمانے میں
رہ گیا بت کدہ مگر باقی
نام کو بھی نہیں کسر باقی
نہ رہے گا خدا کا گھر باقی[۱۳۹]

اسی طرح ''توحید'' میرٹھ میں مولانا نواب علی کی ''نواب شہِ جارج سے جا کے کوئی کہہ دے'' کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی۔ اس نظم میں بھی مسجد کان پور کے سانحے کے حوالے سے انگریزوں کی حکمت علی پر سخت طنز کیا گیا ہے۔ جس طرح عام مسلمانوں کا خون بہایا گیا، حق و باطل کو سمجھے بغیر ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے، اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

خارجِ جز مسجد کو جو مسجد سے ہیں کرتے
کیوں! اب تو یقیں ہے کہ سمجھ ہی گئے ہو گے
برچھوں کی ضرورت تھی نہ کچھ فیر[فائر] کی حاجت
مستِ مے پندار جو حکام نہ ہوتے
نواب شہِ جارج سے جا کر کوئی کہہ دے
وہ تم کو شہیدوں میں بھی داخل نہیں کرتے
سمجھے تھے جفا خلق پہ عادل نہیں کرتے
خود تیغِ زباں سے جو یہ گھائل نہیں کرتے
یوں جاں کو فدا عالم و جاہل نہیں کرتے
اب ہند میں فرقِ حق و باطل نہیں کرتے[۱۴۰]

''مشہدِ اکبر'' کے عنوان سے فارسی کے تین اشعار بھی ''کان پور کی خونیں داستان'' میں درج ہیں۔ اس نظم میں بھی اس قیامت خیز منظر کے بیان میں شاعر کا کہنا ہے کہ:

اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری زخاک
خون خلقے بیگنا ہے بر حریمِ مسجدت

پیروانِ دینِ حق را خوں بہ خاک آغشتہ شد
سر بر آوردیں قیامت درمیانِ خلق بیں
زآستاں بگرشت و مارا خونِ دل از امتیں
از پئے خاکِ کہ ہر مسلم برو ساید جبیں (۱۴۱)

''خونِ شہیداں'' کے عنوان سے بھی ایک نظم مذکورہ کتاب میں شامل ہے۔ اس نظم میں شہیدوں کے خون سے مسلمانوں کے عزم وحوصلے میں جو نمایاں تبدیلیاں رونما ہوں گی، اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

نہیں مٹا نشانِ خوں کبھی دامانِ قاتل سے
ٹپکتا ہے یہ آنسو بن کے چشمانِ یتیماں سے
اسی کا ایک قطرہ بحر کو خوناب کرتا ہے
دہانِ زخم سے بہہ کر کچھ ایسا رنگ لاتا ہے
یہی خوں سینچتا ہے نخل بر بادِ تمنا کو
غذا پا کر اسی سے کشت قومی پھول لاتی ہے
تعجب کیا ہے گر خونِ شہیداں کچھ دکھا جائے
لکھی جاتی ہے اک تحریرِ خونیں خونِ بسمل سے
عیاں ہے آبِ گوہر بن کے یہ لعلِ بدخشاں سے
یہی گردش میں آکر قلب کو بے تاب کرتا ہے
کہ سیرابی سے اس کی باغِ عالم لہلہاتا ہے
اسی سے زندگی ملتی ہے قالب ہائے بے جاں کو
یہی وہ موت ہے، جس سے یہ دنیا جان پاتی ہے
تنِ بے جاں میں شاید پھر ہمارے جان آجائے (۱۴۲)

آگرہ اخبار کے ایڈیٹر نے مشاہدات ملکوتی سے متاثر ہوکر ''چند لمحے شہیدان ستم کے ساتھ'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں بھی شہیدوں کے مراتب اور صلۂ شہادت کی بابت کچھ سوالات و جوابات درج کیے گئے ہیں۔ آخر میں مسلمانوں کی بے کسی و بربادی پر افسوس کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں جو گزرا طرفِ عالمِ روحانیت
جا بجا خون کے چھینٹے تھے کفن پر اتنے

خاک آلودہ تھے بال اور بدن خون آگیں
ان کی آنکھوں سے ٹپکتی تھی نری مایوسی
ان کی حالت پہ مجھے حسرت و حیرت جو ہوئی
اپنی ہستی کو جو دنیا میں مٹایا تو نے
ان کے پیکر کو ہوئی لغزشِ ہستی اک بار
ہمیں خالق سے ملا ہے یہ شہادت کا صلہ
رنج اپنا ہے ہمیں اور نہ اولاد کا ہے
نظر آئے مجھے دس بیس شہیدانِ ستم
صبح دم پھول پہ چھا جاتی ہے جیسے شبنم
آہ! ہر پیکرِ تصویر تھا نقشِ ماتم
مخبرِ کشمکشِ روح تھے اشکِ پیہم
پوچھ بیٹھا سببِ کثرتِ اندوہِ الم
کچھ خدا سے صلہِ ظلم بھی پایا تو نے
اور بڑھا میری طرف اک جسدِ خاکِ بسر
کہ ہمارے لیے ہے جنتِ فردوس میں گھر
غم فقط بے کسیِ مسلمِ برباد کا ہے (۱۴۳)

رسالہ ''کان پور کی خونیں داستان'' کی قطعہ تاریخ منشی ارشاد علی ارشاد بریلوی نے اخبار توحید میں لکھی۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ:

خون آنکھوں سے رلانے کو یہ قصّہ فرد ہے
بہرِ تاریخِ طبع ارشاد نے رو کر کہا
جس کو سن کے ہر بشر کے لب پہ آہِ سرد ہے
داستانِ کان پوری کچھ عجب پُر درد ہے (۱۴۴)

ڈاکٹر سید سعید احمد کے مطابق ''سانحہ کان پور پر جگر مراد آبادی نے ایک طویل رزمیہ نظم لکھی جو ان کے دیوان ''شعلہ طور'' میں شامل ہے۔'' (۱۴۵) مگر جگر کے اس مجموعے میں اس موضوع پر اردو کی کوئی طویل رزمیہ نظم تو شامل نہیں البتہ فارسی میں ''پیرویِ صحابہ کن، اسوہِ پنجتن نگر: خطاب بہ مسلم'' کے عنوان سے ایک نظم ضرور موجود ہے، جس کا انداز رزمیہ نہیں بلکہ

اس نظم کا مقصد مسلمانوں کی بدحالی کسمپرسی اور لاچاری کو ظاہر کرنا ہے۔ جگر نے نظم کے آغاز ہی میں یہ انداز اختیار کیا کہ:

چشم کشاد جانب رزمِ گہہ وطن مگر
خونِ حیات سو بہ سو خاکِ سرشتہ مو بہ مو
مقتلِ کان پور بہ ہیں لاشۂ بے کفن نگر
خلقِ بریدہ کو بہ کو بچہ و مرد و زن نگر(۱۴۵)

نظم کے انداز میں صاف ظاہر ہے کہ اس کا مقصد مسلمانوں کی بے گور وکفن نعشوں اور زخمیوں کی مظلومیت کو ظاہر کرنا ہے۔ مولانا محب حسین حیدر آبادی نے بھی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ اگر سچ اور حق بات کہنے کا حوصلہ نہ ہو تو ایسی آزادی بے معنی ہے۔ اپنی نظم ''بندشیں'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

برتر از قید ہماری ہے محب آزادی
باغ باں دشمنِ جاں اور ہے قاتل صیاد
حق بھی جب کہہ نہ سکیں ہم تو ہیں آزاد عبث
اے اسیرانِ قفس نالہ و فریاد عبث(۱۴۶)

مختلف واقعات اور حالات سے متاثر ہو کر متعدد شعرا کے ہاں اس سانحے کے حوالے سے کچھ نہ کچھ اشارے ضرور ملتے ہیں۔ احمق پھپھوندی نے نظم ''عہد فرنگ'' کے ایک شعر میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

ایک ہنگامہِ محشر ہے بپا چار طرف
گرم ہے معرکہِ دشنہ و شمشیر و تفنگ(۱۴۷)

اسی طرح علامہ فاخر الہ آبادی نے قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے حوالے سے اپنی نظم ''سنتِ سجاد'' میں کہا کہ:

آنکھ ہے محوِ تجلی، وصل سے دل شاد ہے
بیڑیاں مجھ کو پہننے میں ذرا ذلّت نہیں
قید میں بھی طبعِ بے خود ہر طرح آزاد ہے
باپ دادا کا طریقہ سنتِ سجاد ہے(۱۴۸)

معروف شاعر بشارت احقر بہاری جو اس زمانے میں کان پور ہی میں مقیم تھے، نے اس سانحے پر ۷۰ بند کا ایک مسدس لکھا اور کان پور میں منعقدہ احتجاجی جلسے میں سنایا۔ اس نظم کا حاضرین پر بے حد اثر ہوا لیکن حکومت وقت کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس مسدس کو ضبط کر کے ضائع کر دیا۔(۱۴۹) اس واقعے میں متعدد سرکردہ علما بھی گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا آزاد سبحانی

کے علاوہ نظامی پریس کے مالک ابوسعید اور مولانا فیض الحسن گنگوہی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔(۱۵۰)

یہ معرکہ اپنے تاریخی اور سیاسی اثرات کے لحاظ سے ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ سیاسی اعتبار سے یہ معرکہ جنوبی ایشیا میں انگریزی اقتدار کے خلاف پہلی کھلی محاذ آرائی کے طور پر سامنے آیا اور اہل ہند کے سامنے یہ بات آشکار ہوئی کہ انگریزی حکومت کا غلبہ ناقابلِ تسخیر نہیں۔ پروفیسر شریف المجاہد کے مطابق اس واقعے کے بعد برصغیر کی سیاست میں احتجاج اور مظاہرے ایک لازمی حصہ بن گئے۔(۱۵۱) اس واقعے کے بعد بہ قول سید سلیمان ندوی ''آتش بیان مقرروں، شعلہ فشاں محرروں اور شعلہ نفس شاعروں نے مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ یہ واقعہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد اور آزادی پرستی کی سلسلۂ تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے۔''(۱۵۲) اسی واقعے کے بعد مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا شوکت علی، سید سلیمان ندوی اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ نے کھل کر انگریزوں کی مسلم دشمنی پر صدائے احتجاج بلند کی۔ اس واقعے کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہ جیسے اکابر کے لیے اپنے اس موقف کی تائید حاصل کرنا ممکن ہوا کہ ہندوستان دارحرب بن گیا ہے کیوں کہ حکومت اپنی رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کر رہی تھی۔(۱۵۳) اس واقعے کی اثر پزیری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور میں جب کہ معاشرے میں مردوں کی اجارہ داری تھی اور عورتوں کو سیاسی معاملات میں رائے دینے کی آزادی نہیں تھی، ز۔ خ۔ ش۔ نے واضح طور پر رعایا اور حاکم کے درمیان ہونے والی دوری کو محسوس کیا بلکہ اس سانحے کے بعد جو صورتِ حال پیدا ہوئی اس سے متاثر ہو کر لکھا کہ:

پھٹ گیا محکوم و حاکم کا لباسِ اتحاد(۱۵۴)

یہ واقعہ اگرچہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی کا ہے لیکن اس دور کے بعد بھی اسلامی دنیا میں مسلمانوں کے مقدس مقالات کو پامال کر کے ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی گئی لیکن اس اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی دوسری دہائی کی مسلم صحافت نے اس واقعے پر اپنا ردِ عمل خوب ظاہر کیا۔ ان واقعات کی لحہ بہ لحہ روداد کو اس زمانے کے رسائل و جرائد میں بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے اور مورخ کے لیے یہ رسائل ایک اہم دستاویز کے طور پر کام آسکتے ہیں۔ اس صحافتی بیانیے کو اسپنسر لاوان (Spencer Lavan) نے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں پیش کیا ہے۔(۱۵۵) مسجد کان پور کے سانحے نے مغربی استعمار کے خلاف مزاحمتی رویہ پیدا کرنے کا آغاز کیا۔ اس واقعے کی وجہ سے آنے والے دنوں میں آزادی کی تحریک کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ اسی لیے برعظیم کی تاریخ میں اس سانحے کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہے گی۔

حواشی:

(۱) گوپی چند نارنگ، ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو،

۲۰۰۳ء)،ص ۳۳۶

(۲) ضیا الدین احمد برنی، حادثۂ کان پور، مشمولہ حیات مولانا محمد علی جوہر،(کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۲۰۰۱ء)،ص ۱۰۵

(۳) ڈاکٹر سید سعید احمد، شہرِ ادب کان پور،(کراچی: سید اینڈ سید، پبلشرز، ۲۰۰۱ء)،ص ۳۳

(۴) ضیا الدین احمد برنی،محولۂ بالا،ص ۱۰۵

(۵) ایضاً،ص ۱۰۵

(۶) ایضاً

(۷) گوپی چند نارنگ،محولہ بالا،ص ۳۳۶

(۸) ضیا الدین احمد برنی،محولہ بالا،ص ۱۰۶

(۹) مولانا ابوالکلام آزاد، شہدائے کان پور: لکھنؤ کو مجوزہ جلسہ،مشمولہ: الہلال،(۳ ستمبر ۱۹۱۳ء)،ص ۱۴

(۱۰) محمود احمد عباسی، حادثۂ کان پور کی مسئولیت،مشمولہ: الہلال،(۲۳ جولائی ۱۹۱۳ء)،ص ۹۷

(۱۱) روزنامہ ہمدرد،(۸ جولائی ۱۹۱۳ء)، بہ حوالہ: رئیس احمد جعفری، کاروانِ گم گشتہ،(کراچی: رئیس احمد جعفری اکیڈمی، ۱۹۷۱ء)، ص ۴۱۹

(۱۲) ایضاً

(۱۳) محمود احمد عباسی،محولہ بالا،ص ۸۷

(۱۴) کریم احمد، مراسلات،مشمولہ: الہلال،(۲۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء)،ص ۱۵

(۱۵) ہیرالڈ آف انڈیا،(۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء)، بہ حوالہ: رئیس احمد جعفری،محولہ بالا،ص ۴۱۷

(۱۶) روزنامہ ہمدرد،محولہ بالا،ص ۴۱۷

(۱۷) رئیس احمد جعفری، کاروانِ گم گشتہ،محولہ بالا،ص ۴۱۸

(۱۸) ایضاً

(۱۹) ایضاً،ص ۴۱۹

(۲۰) ایضاً،ص ۴۲۰

(۲۱) مولانا محمد علی جوہر، خط، بہ حوالہ: رئیس احمد جعفری،محولہ بالا،ص ۴۲۲

(۲۲) رئیس احمد جعفری،محولہ بالا،ص ۴۲۲۔ ۴۲۳

(۲۳) ایضاً،ص ۴۲۳

(۲۴) پروفیسر محمد سرور، مولانا محمد علی جوہر کے یورپ کے سفر،(لاہور: ادارہ ادبیاتِ نو، ۱۹۴۶ء)،ص ۶۔ ۷

(۲۵) ایضاً،ص ۷

(۲۶) رابعہ طارق، مولانا ظفر علی خان کی آپ بیتی،(لاہور: ندوۃ المعارف، لاہور، ۱۹۹۹ء)،ص ۶۲

(۲۷) مولانا ابوالکلام آزاد،محولہ بالا،ص ۱۴

(۲۸) اشتیاق حسین قریشی، برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ،(کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، ۱۹۹۹ء)،ص ۳۵۰

(۲۹) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی (اعظم گڑھ: طبع معارف، ۱۹۴۳ء)، ص ۶۰۰
(۳۰) ضیاالدین احمد برنی، ص ۱۰۶
(۳۱) سید اشتیاق اظہر، تاریخ کان پور، (کراچی: کان پور اکیڈمی، ۱۹۸۷ء)، ص ۴۵
(۳۲) سید سلیمان ندوی، مشہد اکبر، مشمولہ: نوائے آزادی، عبدالرزاق قریشی (مرتب)، (بمبئی: ادبی پبلشرز، ۱۹۵۷ء)، ص ۱۲۳
(۳۳) عبدالرزاق قریشی، نوائے آزادی، (بمبئی: ادبی پبلشرز، ۱۹۵۷ء)، ص ۱۱۸
(۳۴) رئیس احمد جعفری، کاروانِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص ۴۴۵
(۳۵) سید اشتیاق اظہر، ص ۴۵
(۳۶) سید سلیمان ندوی، ص ۶۰۱
(۳۷) کریم احمد، ص ۳۳
(۳۸) سید اشتیاق اظہر، ص ۴۵
(۳۹) سید سلیمان ندوی، ص ۶۰۱
(۴۰) مولانا ابوالکلام آزاد، مشمولہ: الہلال، (۳ ستمبر ۱۹۱۳ء)، ص ۱۴
(۴۱) سید سلیمان ندوی، مشہد اکبر، محولہ بالا، ص ۱۲۰۔۱۲۱
(۴۲) مولانا ابوالکلام آزاد، مشمولہ: الہلال، ۲۰ (اگست ۱۹۱۳ء)، ص ۱۶
(۴۳) کریم احمد، ص ۳۴
(۴۴) خواجہ حسن نظامی، بہ حوالہ رئیس احمد جعفری، کاروانِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص ۴۲۴
(۴۵) مولانا ابوالکلام آزاد، مسجد کان پور: رویت و روایت، مشمولہ: الہلال، (۲۰ اگست ۱۹۱۳ء)، ص ۱۶
(۴۶) سید سلیمان ندوی، مشہد اکبر، محولہ بالا، ص ۱۲۱
(۴۷) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، محولہ بالا، ص ۶۰۱
(۴۸) رام ناتھ، مراسلہ، مشمولہ: الہلال، (۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء)، ص ۸
(۴۹) مولانا ابوالکلام آزاد، حادثہ کان پور تصحیح و تصدیق، مشمولہ: الہلال، (یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء)، ص ۔۵
(۵۰) رئیس احمد جعفری، کاروانِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص ۴۱۱
(۵۱) سید سلیمان ندوی، مشہد اکبر، محولہ بالا، ص ۱۲۴
(۵۲) بہ حوالہ الہلال، (۲۰ اگست ۱۹۱۳ء)، ص ۔۳
(۵۳) مولانا ابوالکلام آزاد، مشمولہ: الہلال، (۳ ستمبر ۱۹۱۳ء)، ص ۱۴
(۵۴) عبدالرزاق قریشی، نوائے آزادی، محولہ بالا، ص ۱۲۴
(۵۵) کریم احمد، ص ۳۴
(۵۶) بہ حوالہ الہلال، (۱۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء)، ص ۱۹
(۵۷) مشمولہ: ہمدرد، (۲۸ اگست ۱۹۱۳ء)، بہ حوالہ: رئیس احمد جعفری، کاروانِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص ۴۴۱
(۵۸) نامہ نگار، کان پور کے قیدیوں اور مجروحین کی کیفیت، مشمولہ: علی برادران، رئیس احمد جعفری (مرتب)، (لاہور: محمد علی اکیڈمی، ۱۹۲۳ء)، ص ۱۷۳۔۱۷۴

(۵۹) خواجہ حسن نظامی، کان پور کی خونیں داستان، (میرٹھ: سید پریس، ۱۹۱۳ء)، ص ۱۸
(۶۰) خان محمد قریشی، مشمولہ: الہلال، (۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء)، ص ۲۰
(۶۱) کریم احمد، ص ۳۴
(۶۲) بہ حوالہ الہلال، (۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء)، ص ۴
(۶۳) مولوی حکیم محمد رضوان، مشمولہ: الہلال، (۱۲ نومبر ۱۹۱۳ء)، ص ۱۹
(۶۴) دیکھیے: الہلال، (۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء)، ص۔ ۴
(۶۵) دیکھیے: الہلال، (۱۸ اکتوبر ۱۹۱۴ء)، سرورق، ص ندارد
(۶۶) دیکھیے: الہلال، (یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء)، ص ندارد
(۶۷) دیکھیے: الہلال، (۲۴ ستمبر۔۔۔)، ص آخر
(۶۸) خواجہ حسن نظامی، ص سرورق
(۶۹) بہ حوالہ، الہلال، (۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء)، ص ۱۹
(۷۰) مظہر الحق نعمانی ردولوی، مشمولہ: الہلال، (یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء)، ص ۷
(۷۱) دیکھیے: الہلال، (۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء)، ص سرورق
(۷۲) بہ حوالہ رئیس احمد جعفری، کاروانِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص ۴۴۹
(۷۳) سید اشتیاق اظہر، محولہ بالا، ص ۴۵
(۷۴) سر علی رضا، مشمولہ: پندرہ روزہ آج کل، دہلی، (یکم ستمبر ۱۹۴۳ء)، ص ۲۴
(۷۵) دیکھیے: الہلال، (۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء)، ص ۳۰
(۷۶) دیکھیے: الہلال، (۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء)، ص ۱۸۔ ۲۰
(۷۷) دیکھیے: الہلال، (۱۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء)، ص ۱۹
(۷۸) محمد علی افسوس، مشمولہ: الہلال، (۱۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء)، ص ۱۹
(۷۹) سید احمد حسین، دیکھیے: الہلال، (۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء)، ص ۱۵
(۸۰) مولانا رشید، مصالحہ، مسجد کان پور کے متعلق چند شکوک، مشمولہ: الہلال، (۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء)، ص ۱۵۔ موصوف مدرسہ عالیہ کلکتہ سے منسلک تھے۔
(۸۱) دیکھیے: الہلال، (۵ نومبر ۱۹۱۳ء)، ص ۱۹
(۸۲) سر علی رضا، تقریر، (۸ ستمبر ۱۹۱۳ء)، مشمولہ: علی برادران، محولہ بالا، ص ۳۸۰۔ ۳۸۱
(۸۳) نامہ نگار، کان پور کے مشرح حالات، مشمولہ: علی برادران، محولہ بالا، ص ۴۰۳۔ ۴۰۶
(۸۴) ڈاکٹر وقار احمد رضوی، تاریخ جدید اردو غزل، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۸ء)، ص ۴۸۸
(۸۵) نامہ نگار، کان پور کے مشرح حالات، محولہ بالا، ص ۴۰۶
(۸۶) رئیس احمد جعفری، ص ۴۴۰۔ ۴۴۱
(۸۷) مولانا ابوالکلام آزاد، شہدائے کان پور کا مجوزہ جلسہ۔ ہندوستان کے انگریزی عہد کی آزادی کا خاتمہ۔ فرمانِ نادری کا ورود، مشمولہ: الہلال، (۱۰ ستمبر ۱۹۱۳ء)، ص ۹

(۸۸) الہلال کے اس شمارے میں سہواً ۱۹۱۳ء کے بجائے ۱۹۱۳ء درج ہے۔
(۸۹) دیکھیے: الہلال، (۳ ستمبر ۱۹۱۳ء)، ص ۱۰
(۹۰) رئیس احمد جعفری، کاروانِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص ۴۲۶
(۹۱) پانیر، بہ حوالہ: رئیس احمد جعفری، کاروانِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص ۴۲۰
(۹۲) ہمدرد، بہ حوالہ رئیس احمد جعفری، کاروانِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص ۴۲۰
(۹۳) سید سلیمان ندوی، محولہ بالا، ص ۶۰۱
(۹۴) رئیس احمد جعفری، محولہ بالا، ص ۴۳۰۔ ۴۳۳
(۹۵) ایضاً، ص ۴۳۸
(۹۶) بہ حوالہ رئیس احمد جعفری، محولہ بالا، ص ۴۳۶
(۹۷) سید سلیمان ندوی، محولہ بالا، ص ۶۰۱
(۹۸) اشتیاق اظہر، محولہ بالا، ص ۴۳۔ ۴۴
(۹۹) کریم احمد، محولہ بالا، ص ۳۴
(۱۰۰) گوپی چند نارنگ، محولہ بالا، ص ۳۳۶
(۱۰۱) فرید آبادی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۸ء)، ص ۵۳۴
(۱۰۲) عبید اللہ قدسی، آزادی کی تحریکیں، (لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۸ء)، ص ۱۳۳
(۱۰۳) خواجہ حسن نظامی، بہ حوالہ، کاروانِ گم گشتہ، رئیس احمد جعفری، محولہ بالا، ص ۴۲۵
(۱۰۴) خواجہ حسن نظامی، ص ۱۔ ۳
(۱۰۵) سید سلیمان ندوی، محولہ بالا، ص ۶۰۲۔ ۶۰۳
(۱۰۶) علامہ شبلی نعمانی، کلیات شبلی، (اعظم گڑھ: معارف پریس، ۱۹۴۰ء)، ص ۸۰۔ ۸۱
(۱۰۷) ڈاکٹر سلام سندیلوی، مولانا شبلی کی اردو شاعری، مشمولہ: ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، (ستمبر ۱۹۶۰ء)، ص ۱۶۵
(۱۰۸) شیخ محمد اکرام، شبلی نامہ، (بمبئی: تاج آفس محمد علی روڈ، سن ندارد)، ص ۲۴۳
(۱۰۹) علامہ شبلی نعمانی، محولہ بالا، ص ۸۱
(۱۱۰) صدیق احمد صدیقی، شبلی کی سیاسی شاعری پر ایک طائرانہ نظر، مشمولہ: ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، محولہ بالا، ص ۱۷۳
(۱۱۱) علامہ شبلی نعمانی، محولہ بالا، ص ۸۲
(۱۱۲) ایضاً، ص ۸۴
(۱۱۳) ایضاً
(۱۱۴) سید سلیمان ندوی، محولہ بالا، ص ۶۰۴۔ ۶۶۲
(۱۱۵) علامہ شبلی نعمانی، محولہ بالا، ص ۸۵
(۱۱۶) ایضاً، ص ۸۲۔ ۸۵
(۱۱۷) رئیس احمد جعفری، محولہ بالا، ص ۴۱۳
(۱۱۸) سید سلیمان ندوی، محولہ بالا، ص ۶۰۵

(۱۱۹) علامہ شبلی نعمانی، محولہ بالا، ص ۸۳۔ ۸۴
(۱۲۰) رئیس احمد جعفری، محولہ بالا، ص ۴۱۴
(۱۲۱) سید سلیمان ندوی، محولہ بالا، ص ۶۰۶
(۱۲۲) علامہ شبلی نعمانی، محولہ بالا، ص ۸۷
(۱۲۳) اکبر آلہ آبادی، بہ حوالہ، اکبر کا سیاسی مسلک، از مولانا عبدالماجد دریابادی، مشمولہ: نگار، کراچی، اکبر الہ آبادی نمبر، (نومبر دسمبر ۱۹۶۹ء)، ص ۱۸
(۱۲۴) عبدالماجد دریابادی، اکبر کا سیاسی مسلک، محولہ بالا، ص ۱۸
(۱۲۵) اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر، محمد اکرام چغتائی (مرتب)، (لاہور: میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۴۸۳
(۱۲۶) اکبر الہ آبادی، مشمولہ: اردو میں قومی شاعری کے سو سال، علی جواد زیدی (مرتب)، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، (۱۹۸۲ء)، ص ۱۷۶
(۱۲۷) اکبر الہ آبادی، بہ حوالہ: کان پور کی خونیں داستان، محولہ بالا، ص ب
(۱۲۸) ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ظفر علی خاں، ادیب و شاعر، (لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب، ۱۹۶۷ء،) ص ۲۱۳۔ ۲۱۴
(۱۲۹) مولانا ظفر علی خاں، مشمولہ: اردو میں قومی شاعری کے سو سال، محولہ بالا، ص ۱۹۹
(۱۳۰) مولانا ظفر علی خاں، طاقت ایمانی، مشمولہ: ضبط شدہ نظمیں، خلیق انجم، مجتبیٰ حسین (مرتبین)، (نئی دہلی: مجلس جشن علی جواد زیدی، ۱۹۷۵ء)، ص ۲۰۱
(۱۳۱) رئیس احمد جعفری، محولہ بالا، ص ۴۴۸۔ ۴۵۲
(۱۳۲) کیفی چڑیا کوٹی، قطعہ، مشمولہ: کاروانِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص ۴۵۲
(۱۳۳) حکیم الطاف حسین آزاد انصاری، مشمولہ: کاروانِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص ۴۵۲
(۱۳۴) بہ حوالہ، کاروانِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص ۴۶۵
(۱۳۵) راقم فریادی، مسلمانوں کی فریاد، مشمولہ: علی برادران، محولہ بالا، ص ۴۱۲
(۱۳۶) حامد اللہ افسر، مسجد سے خطاب، مشمولہ: علی برادران، محولہ بالا، ص ۴۰۰
(۱۳۷) قمر الدین قمر سندیلوی، مشمولہ: علی برادران، محولہ بالا، ص ۳۹۰
(۱۳۸) نامعلوم، عشق بازوں کی سرفروشی، مشمولہ: کان پور کی خونیں داستان، محولہ بالا، ص ۳
(۱۳۹) نامعلوم، بہ حوالہ، کان پور کی خونیں داستان، محولہ بالا، ص ۱۲
(۱۴۰) مولانا نواب علی، نواب شہِ جارج سے جا کر کوئی کہہ دے، مشمولہ: کان پور کی خونیں داستان، محولہ بالا، ص ۲۵
(۱۴۱) نامعلوم، مشہدِ اکبر، مشمولہ: کان پور کی خونیں داستان، محولہ بالا، ص ۱۳
(۱۴۲) نامعلوم، خون شہیداں، مشمولہ: کان پور کی خونیں داستان، محولہ بالا، ص ۲۶۔ ۲۷
(۱۴۳) مدیر آگرہ، چند لمحے شہیدانِ ستم کے ساتھ، مشمولہ: کان پور کی خونیں داستان، محولہ بالا، ص ۲۷
(۱۴۴) منشی ارشاد علی بریلوی، تاریخ طبع رسالہ ہذا، مشمولہ: کان پور کی خونیں داستان، محولہ بالا، ص ۳۱
(۱۴۵) جگر مرادآبادی، خطاب بہ مسلم، مشمولہ: کلیات جگر، (حیدرآباد: لبرٹی پبلشرز اینڈ پرنٹرز، ۱۹۵۸ء)، ص ۲۲۶۔ ۲۲۸
(۱۴۶) مولانا محب حسین حیدرآبادی، بندشیں، مشمولہ: اردو میں قومی شاعری کے سو سال، محولہ بالا، ص ۱۷۶

(۱۴۷) احمق پھپھوندی، عہد فرنگ، مشمولہ: اردو میں قومی شاعری کے سو سال، محولہ بالا، ص ۲۱۵

(۱۴۸) علامہ فاخر الہ آبادی، سنت سجاد، مشمولہ: اردو میں قومی شاعری کے سو سال، محولہ بالا، ص ۲۲۳

(۱۴۹) بشارت حسین احقر بہاری، بہ حوالہ، شہر ادب کان پور، محولہ بالا، ص ۳۶

(۱۵۰) کریم احمد، ص ۳۴

(۱۵۱) ایضاً

(۱۵۲) سید سلیمان ندوی، محولہ بالا، ص ۶۰۳

(۱۵۳) مولانا سید محمد میاں، تحریک شیخ الہند: انگریزی سرکار کی زبان میں ریشمی خطوط سازش کیس، (لاہور: نگارشات پبلشرز، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۹۴۔ اس کتاب کے مرتب نے سہواً سانحہ کان پور کے سن اور تاریخ کی بابت ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء کی تاریخ درج کی ہے۔ درست تاریخ کی وضاحت مقالے میں کی جا چکی ہے۔

(۱۵۴) ز۔ خ۔ ش۔ بہ حوالہ، ز۔ خ۔ ش۔ حیات و شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، از فاطمہ حسن، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۷ء)، ص ۶۹

(۱۵۵) اسپنسر لاوان، "The Kanpur Mosque Incident of 1913: The North Indian Muslim Press and its Reaction to Community Crises"، مشمولہ "Journal of the American Academy of Religion"، جلد ۴۲، شمارہ ۲، جون ۱۹۷۴ء، اوکسفرڈ پریس، ص ۲۶۳۔ ۲۷۹

مآخذ:

(۱) احمد، ڈاکٹر سید سعید، شہرِ ادب کان پور، کراچی: سید اینڈ سید، پبلشرز، ۲۰۰۱ء

(۲) اظہر، سید اشتیاق، تاریخِ کان پور، کراچی: کان پور اکیڈمی، ۱۹۸۷ء

(۳) اکرام، شیخ محمد، شبلی نامہ، بمبئی: تاج آفس محمد علی روڈ، سن ندارد

(۴) انجم، خلیق حسین، مجتبیٰ (مرتبین)، ضبط شدہ نظمیں، نئی دہلی: مجلس جشن علی جواد زیدی، ۱۹۷۵

(۵) برنی، ضیاالدین احمد، حادثۂ کان پور، مشمولہ حیات مولانا محمد علی جوہر، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۲۰۰۱ء

(۶) جعفری، رئیس احمد، علی برادران، لاہور: محمد علی اکیڈمی، ۱۹۲۳ء

(۷) چغتائی، محمد اکرام (مرتب)، کلیاتِ اکبر، لاہور: میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

(۸) حسن، فاطمہ، ز۔ خ۔ ش۔ حیات و شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۷ء

(۹) رابعہ طارق، مولانا ظفر علی خان کی آپ بیتی، لاہور: ندوۃ المعارف، لاہور، ۱۹۹۹ء

(۱۰) رضوی، ڈاکٹر وقار احمد، تاریخ جدید اردو غزل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۸ء

(۱۱) ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ظفر علی خان: ادیب و شاعر، لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب، ۱۹۶۷ء

(۱۲) زیدی، علی جواد (مرتب)، اردو میں قومی شاعری کے سو سال، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۸۲ء

(۱۳) سرور، پروفیسر محمد، مولانا محمد علی جوہر کے یورپ کے سفر، لاہور: ادارہ ادبیاتِ نو، ۱۹۴۶ء

(۱۴) فرید آبادی، سید ہاشمی، تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۸ء

(۱۵) قدسی، عبداللہ، آزادی کی تحریکیں، لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۸ء

(۱۶) قریشی، اشتیاق حسین، برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، ۱۹۹۹ء
(۱۷) قریشی، عبدالرزاق، نوائے آزادی، بمبئی: ادبی پبلشرز، ۱۹۵۷ء
(۱۸) میاں، مولانا سید محمد، تحریکِ شیخ الہند: انگریزی سرکار کی زبان میں ریشمی خطوط سازش کیس، لاہور: نگارشات پبلشرز، ۱۹۹۱ء
(۱۹) نارنگ، گوپی چند، ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۳ء
(۲۰) ندوی، سید سلیمان، حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: طبع معارف، ۱۹۴۳ء
(۲۱) نظامی، خواجہ حسن، کان پور کی خونیں داستان، میرٹھ: سید پریس، ۱۹۱۳ء
(۲۲) نعمانی، علامہ شبلی، کلیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: معارف پریس، ۱۹۴۰ء

رسائل و جرائد

(۱) ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر مولانا شبلی کی اردو شاعری، شمارہ ستمبر ۱۹۶۰ء
(۲) _____، _____، شبلی کی سیاسی شاعری پر ایک طائرانہ نظر، _____
(۳) آج کل، پندرہ روزہ، دہلی، شمارہ یکم ستمبر ۱۹۴۳ء
(۴) الہلال، شمارہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۳ء
(۵) _____، شمارہ ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء
(۶) _____، شمارہ ۳ ستمبر ۱۹۱۳ء
(۷) _____، شمارہ ۱۰ ستمبر ۱۹۱۳ء
(۸) _____، ۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء
(۹) _____، شمارہ یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء
(۱۰) _____، ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء
(۱۱) _____، مارہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء
(۱۲) زمیندار، ۴ جولائی ۱۹۳۵ء
(۱۳) سیاست، روزنامہ، ۳ جولائی ۱۹۲۵ء
(۱۴) نگار، کراچی، اکبر الہ آبادی نمبر، شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۶۹ء
(۱۴) ہمدرد، روزنامہ، شمارہ ۸ جولائی ۱۹۱۳ء
(۱۵) _____، ۲۸ اگست ۱۹۱۳ء
(۱۶) ہیرالڈ آف انڈیا، شمارہ ۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء
(17) "The Kanpur Mosque Incident of 1913: The North Indian Muslim Press and its Reaction to Community Crises", included "Journal of the American Academy of Religion", Vol. 42, No. 2, June 1974, Oxford Press, p. 263-279